جنوبی پنجاب کے اردو افسانے میں مزاحمتی عناصر

(جاوید اختر بھٹی، علی تنہا، انوار احمد، حفیظ خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی، دردانہ نوشین خان، احمد اعجاز)

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار

کاظم حسین

رجسٹریشن نمبر:259-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۲۰۲۳ء

K

TH-27806

MS
891.4393
ک ا ج

اردو ادب - افسانہ
اردو افسانوں میں مزاحمتی عناصر

جنوبی پنجاب کے اردو افسانے میں مزاحمتی عناصر

(جاوید اختر بھٹی، علی تنہا، انوار احمد، حفیظ خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی، دردانہ نوشین خان، احمد اعجاز)

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

کاظم حسین

رجسٹریشن نمبر:259-FLL/MSURDU/F20

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیہ زبان وادب

CENTRAL LIBRARY

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

اقرار نامہ

میں کاظم حسین، رجسٹریشن نمبر:259-FLL/MSURDU/F20حلفیہ اقرار کرتاہوں کہ مقالہ بعنوان **"جنوبی پنجاب کے اردو افسانے میں مزاحمتی عناصر (جاوید اختر بھٹی، علی تنہا، انوار احمد، حفیظ خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی، دردانہ نوشین خان، احمد اعجاز)"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اِسلامی، یونی ورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

کاظم حسین

مقالہ نگار

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **''جنوبی پنجاب کے اردو افسانے میں مزاحمتی عناصر (جاوید اختر بھٹی، علی تنہا، انوار احمد، حفیظ خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی، دردانہ نوشین خان، احمد اعجاز)**

مقالہ نگار: کاظم حسین

رجسٹریشن نمبر: 259-FLL/MSURDU/F20

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی
ایسوسی ایٹ پروفیسر
وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئر پرسن، شعبہ اردو

تصدیق نامہ

کاظم حسین نے رجسٹریشن نمبر:259-FLL/MSURDU/F20 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان **"جنوبی پنجاب کے اردو افسانے میں مزاحمتی عناصر (جاوید اختر بھٹی، علی تنہا، انوار احمد، حفیظ خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی، دردانہ نوشین خان، احمد اعجاز)"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحن کو بھجوادیا جائے۔

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

فہرستِ ابواب

پیش لفظ

باب اوّل: ادب اور مزاحمت: اجمالی جائزہ

باب دوم: جنوبی پنجاب میں منتخب اردو افسانہ نگار اور سیاسی مزاحمتی عناصر

باب سوم: جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگار اور سماجی و معاشی مزاحمتی عناصر

باب چہارم: جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول اور جاگیر داری نظام کے خلاف مزاحمت

محاکمہ (ماحصل):

کتابیات:

انتساب

والدین کریمین

اور

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے علمبرداروں کے نام

اظہار تشکر

خالقِ لم یزل کے حضور ہدیۂ حمد و ثنا پیش کرتا ہوں کہ جس نے مجھے صاحب فکر و شعور بنایا اور انداز تکلم کے ساتھ ساتھ قوتِ تحریر بخشی۔ بے حد و بے حساب درود و سلام کے نذرانے اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تاجدار کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کے حضور پیش کرتا ہوں کہ جن کی ذاتِ والاصفات کی بدولت شرف ایمان میسر ہوا اور شعور آدمیت ملا۔

میں اپنے مقالہ کی تکمیل پر سب سے پہلے اپنے والدین کا ممنونِ احسان ہوں کہ جن کی خوب صورت تربیت نے مجھے ذوقِ سخن عطا فرمایا اور انتہائی ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں اپنے مقالہ کے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کے حضور کہ جن کی رہنمائی نے مجھے منزل تک پہنچنے کا جذبہ اور نشانِ منزل عطا فرمایا۔ انتہائی شکر گزار ہوں میں اپنے اساتذہ کرام جناب ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر ارشد معراج، ڈاکٹر طاہر نواز، ڈاکٹر مظہر علی طلعت، ڈاکٹر حمیرا اشفاق، ڈاکٹر صباحت مشتاق صاحبہ کا جنھوں نے قدم قدم پر میری رہبری فرمائی۔ میں تہیم قلب سے شکر گزار ہوں جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کا جنھوں نے مقالے کی تیاری میں مفید مشورے، قیمتی وقت محبتوں/شفقتوں کے ساتھ ساتھ اپنی تصانیف بھی مجھے بطور تحفہ عنایت فرمائیں۔ میں اپنے اہل خاندان کا شکر گزار ہوں خصوصاً چھوٹے بھائی انجینئر محمد صدام، انجینئر محمد گلفام کا جنھوں نے قدم قدم پر مجھے ڈھارس دی۔ میں اپنی خیر اندیش انتہائی عزیز دوست زر بادشاہ اور قرۃ العین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اپنے خلوص اور دعاؤں سے مجھے منزل آشنا ہونے میں مدد کی جس سے میرے لیے ادب کی راہیں ہموار ہوئیں۔

میں اپنے محسن ڈاکٹر جلیل الرحمٰن اعوان، ڈاکٹر شعیب عتیق خان، علامہ عبدالمجید فیضی، سر آغا گل، محمد اسحاق خان اور حسن مجتبیٰ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے گاہے گاہے مقالے کی تکمیل میں ہر ممکن تعاون کیا۔ میں اپنے رفقاء راہ علم محمد احمد صدیقی، سید خرم عباس کاظمی، رضا علی عابدی، سید شمس الدین گیلانی، وسیم عباس، رانا ارشد نجم اور راشد عباسی کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں جنھوں نے مجھے اس سفر میں اپنی محبت بھری رفاقت کے ساتھ ساتھ بہت سے امور میں مدد فراہم کی۔

خاص طور پر میں اپنے بڑے بھائی رسالدار میجر باقر حسین تہیم کا ممنون ہوں کہ انہوں نے والد مرحوم و مغفور کے انتقال کے بعد حقیقتاً باپ کی طرح اپنا سایۂ عاطفت عطا کیا۔ زندگی کی ڈگر پر لڑکھڑانے نہ دیا اور زندگی کی

شاہراہ پر پوری آب وتاب سے رواں دواں رکھا۔آج انہی کی محبت، شفقت اور دست گیری کی بنا پر میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔اللہ پاک میرے تمام اساتذہ کرام اور احباب کو سلامت رکھے۔آمین

کاظم حسین

مقالہ نگار

باب اوّل

ادب اور مزاحمت: اجمالی جائزہ

ا۔ ادب کی تعاریف اور توضیح

ب۔ ادب میں سماج کی اہمیت

ج۔ مزاحمت کے مبادیات

د۔ ادب میں مزاحمت کی روایت

ا: ادب کی تعاریف اور توضیح

لفظ ادب عربی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔اس کا مادہ اشتقاق ''مادبۃ'' ہے۔ جسے ضیافت مہمان نوازی اور دعوت طعام کے دستر خوان کے معنوں میں برتا گیا۔عہد اسلام میں اس کا استعمال بسیط ہو گیا۔ادب کا لفظ مختلف زاویوں اور معانی میں استعمال ہونے لگا۔اہل عرب میں تہذیب و شائستگی کو ادب کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ان کے نزدیک جو شخص ادب والا ہوگا وہی بااخلاق اور شائستہ ہوگا۔ادب ایسا علم ہے جس کے وسیلے سے الفاظ اور تحریر شدہ شکل میں مقصود قلب دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ادب کا موضوع لفظ اور خط ہے۔ معروف عربی لغت القاموس کے مطابق ادب کے معانی سلیقہ، تہذیب، شائستگی اچھا طریقہ کسی علم و فن یا صنعت و حرفت کے آداب ہیں۔(۱)

اپنے ماضی الضمیر اور مقصود کلام کو خوب صورت انداز تکلم اور فصاحت سے بیان کرنا۔ کلام نثری ہو یا نظمیہ اس کے الفاظ کا چناؤ متوازن مفہوم توضیح کے ساتھ نرالا اور پر اثر ہو اسے ادب کہا جاتا ہے۔(۲)

انگریزی میں ادب کے لیے ''Literature'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جب کہ ادب کے ''معانی ہر چیز کی حد کو نگاہ رکھنا، حفظ مراتب کسی بزرگی یا عظمت کا پاس، تہذیب، شائستگی، تمیز، احترام''۔(۳)

قائد اللغات میں اس کے معنی ''ہر چیز کے اندازے اور حد پر نگاہ رکھنا، حفظ مراتب، قاعدہ، دستور، تمیز، شائستگی اور تہذیب لیے گئے ہیں''۔(۴)

معلوم تہذیبی تاریخ کے ہر دور میں ادب امن و سلامتی کا پیامبر رہا ہے۔ادب اپنے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں ایسے پہلو کو جگہ نہیں دیتا جو کسی بھی معاشرے میں انارکی، انسانوں کے تعلقات میں دراڑ کا باعث بنے۔ادب نے انسانی معاشرے کی بقا، بین الاقوامی امن سے وابستہ رہنے، قوت بخش توانائی مہیا کرنے کے تصورات اور عملی حقیقتوں سے آشنا کیا ہے۔ادب امن کا داعی ہے۔اس کی صداقت، ہئیت، اغراض و مقاصد پر ضروری ہے کہ طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ادب کائنات ارضی کی سربستہ صداقتوں کی منظر کشی ہی نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنے دروں جذب کر کے ان میں جذبات و احساسات کی گرمی پیدا کر کے ان کو نیا زاویہ بخشتا ہے۔سید احتشام حسین ادب کی تعریف یوں متعین کرتے ہیں:

> ''ادب لکھنے والے کے شعور اور خیالات کا وہ اظہار ہے جسے وہ سماج کے دوسرے افراد تک پہنچانے کے لیے ایسے فنی ذرائع سے نمایاں کرتا ہے۔ جسے وہ سمجھ سکیں اور جس سے لطف حاصل کر سکیں۔ یا کم سے کم سمجھنے کی کوشش کر سکیں۔''(۵)

نیومین کے مطابق:

''وہ تمام افکار اور احساسات جو زبان اور لفظ کے ذریعے ادا ہوں وہ ادب کہلاتے ہیں۔''(۶)

مائی کین نے ادب کی تعریف یوں بیان کی:

''قدرت نے انسان میں جو سرمدی خصوصیات ودیعت کر رکھی ہیں انہیں کا اظہار ادب کہلاتا ہے۔''(۷)

والٹر پیٹر نے ادب کی تعریف ایسے بیان کی:

''ادب نفس کاملہ انسانی کی ترجمانی یا انعکاسی اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے کمالات معنوی یا فضائل باطنی کا پورا پورا نقش کسی تحریر یا موضوع اظہار میں جلوہ گر یا منقش ہو جائے۔''(۸)

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''ادب وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خالص نفسیاتی، شخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید بھی کرتا اور اپنے تخیل اور قوت مخترعہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے موثر پرائے اختیار کرتا ہے جس سے سامع و قاری کا جذبہ تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہو۔''(۹)

ادب قوت اظہار کا بہترین حوالہ ہوتا ہے۔ادب معاشرے کے افراد کے ہمہ قسمی رویوں کا آئینہ ہوتا ہے جس میں افراد اپنے ارد گرد کی عملی صورت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ادب افراد معاشرہ کے شعور، ادراک اور اظہار کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ادب ادیب کے خیالات کی صورت گری کر کے اس کے فکر و احساس کو حسن اظہار عطا کرتا ہے۔ہر تخلیق کار جب اپنے ارد گرد وقوع پذیر ہونے والی معاشرتی حقیقتوں اور سماجی رویوں کا نظارہ کرتا ہے۔تو انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر بصورت الفاظ رقم کرتا ہے۔ادب ہمہ قسمی حقیقتوں، فکر و احساس، تجربات اور تاثرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ادب اور ادبی تخلیقات کی زبان کسی بھی زبان کے روزمرہ سے مختلف ہوتی ہے۔ادب کا طرز اظہار، اسلوب نگارش موثر اور

قاری کے جذبات واحساسات پر گہری چھاپ ڈالتا ہے۔ ادب ہی کی بدولت انسان ذہنی اور روحانی طور پر ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ ادب جذباتیت اور حساسیت کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ ادب زندگی کی صداقتوں کا علمبردار ہوتا ہے جس میں ہم زندگی کے کسی بھی پہلو کو ادبی موضوع بنا سکتے ہیں۔ ادب میں بیان کردہ تجربات ومشاہدات میں تاثیر ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے قلوب واذہان پر مختلف کیفیتیں وارد کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جن کی روشنی میں افراد اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام زاویوں کو سنوار سکتے ہیں۔ گویا ادب نوع انسانی کا مغز اور اس کی صدائے باطن ہے جو فرد واحد کے سہارے کا متلاشی نہیں ہوتا۔ ادب کے روبرو جملہ انسانیت ہوتی ہے۔ آفاقی ادب میں یہ خاص صفت ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے تصور اور اس کی اعلیٰ قدروں کو پوری قوت اور شدت جذبات کے ساتھ دنیا کے روبرو لاتا ہے۔

ب: ادب میں سماج کی اہمیت

سماج یا معاشرہ انگریزی زبان کے لفظ "society" کے ہم معنی کے طور پر اردو میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ویبسٹرز نیو انگلش ڈکشنری کے مطابق سوسائٹی کی تعریف یہ ہے۔

> Human beings in general taken in relation to one an other, an organized community, a body of person united for some common purpose, for The more cultivated or more fashimable part of the community. (۱۰)

ادب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ کوئی بھی ادب سماجی رویوں سے الگ ہو کر تخلیق نہیں ہو سکتا۔ ادب اور معاشرے میں مضبوط تعلق ہوتا ہے دراصل یہ سماجی رویوں کا تحریری اظہار ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے معروف ادیب ڈی بونالڈ قم طراز ہیں:

> Literature is the expression of society.(۱۱)

انسانی زندگی اور سماجی رویوں کی عکاسی جس طرح ادب کر سکتا ہے ویسی کسی اور چیز سے یہ منظر کشی ممکنات میں سے نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی سماج اور اس کی تہذیب زندگی کی حقیقی بنیاد ہوتے ہیں۔ ادیب اپنے گردوپیش اور سماج کی عملی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنے سماج اور اس کے رویوں کو سامنے نہیں لاتا تو وہ اپنے سماج سے حقیقی تعلق نہیں رکھتا۔ ادب انسانی بصیرت کی تحریری شکل ہوتی ہے جو اس کی لطافت ذہنی اور حساس افکار کے نئے زاویے اجاگر کرتی ہے۔ ادب شعور اور لاشعور کی ان تمام صلاحیتوں کا مرقع کھینچ کر سامنے لاتا ہے، جن سے افراد معاشرہ کی شخصیات کی تعمیر ہوتی ہے۔ ادب مستقبل کے حالات کو معاشرے کے عام افراد سے پہلے بھانپ کر انہیں قرطاس کی زینت بنا دیتا ہے چاہے وہ کسی بھی سماجی رویے سے منسلک ہوں۔

> "ادب سماجی دھاروں سماجی تبدیلیوں سماجی ارتقاء اور ان سے پیدا ہونے والے انقلاب کی صورت گری بھی کرتا ہے۔ ادب اپنے دور کے سماجی اور ذاتی بحران کو سیاسی لیڈروں اور سماجی سائنسدانوں سے بہت پہلے دیکھ لیتا ہے۔" (۱۲)

ادب اور سماج ایک دوسرے کیلئے بہت اہمیت کے حامل ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ جیسے سماج ادب پر اپنا اثر قائم کرتا ہے اسی طرح ایک بہترین ادب سماج کی روح کو اپنے اثرات میں جذب کر لیتا ہے۔ ادب ہمیشہ سماج سے ہی اپنے لیے موضوعات اخذ کرتا ہے اور کوئی بھی زبان وسیلہ اظہار بن جاتی ہے۔ زبان سماج کے باہمی رابطے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان کے توسط سے ہی سماج ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد اپنی اجتماعی زندگی میں بایک دگر شراکت دار اور معاشرتی اصول وضوابط کا پابند ہوتا ہے۔ سماج پر فرد انفرادی طور پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے اور اس کے رد عمل میں سماج فرد پر اپنا عکس چھوڑتا ہے۔ انسانی اخلاق اور رویے سماج کے مجموعی ڈھانچے میں تغیر و تبدل کا باعث بنتے ہیں۔ ادیب چونکہ سماج کا حساس الطبع فرد ہوتا ہے اس کی ادراک کی صلاحیت عام انسانوں سے تیز ہوتی ہے۔ وہ سماج میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور ہونے والی تبدیلیوں سے شدید متاثر ہوتا ہے، یہ اثرات اس کے ذہن اور دل کی حساس سطح کو شدت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ وہ اپنے الفاظ اور سنجیدہ اسلوب تحریر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

> "ادب ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعور و ادراک حاصل کرنے کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخیلی تجربے کو ابھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب میں متحرک کرنے اور ہماری روح میں موجود خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ ادیب ایک ایسا انسان ہے جس میں ادراک کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور اس سے اظہار کی قوت بھی۔" (۱۳)

انسان اپنی فکر، اپنی ذات کے ذوق کے مطابق مختلف مشاغل، تصورات اور تخیلات کے نئے جہان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس کے تمام تر مشاغل اور خصوصیات میں فنون لطیفہ بہترین شاہکار قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

تصویر کشی، لطیف جذبات و احساسات، موسیقی اور رقص یہ سب انسان کی ذات کا حصہ ہیں۔ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق براہ راست سماج سے ہے خصوصاً شعر و ادب کا جہاں انسانی توسل سے معاشرتی زندگی، متمدن زندگی، تہذیب اور سیاست کے مختلف زاویوں کو اپنے ادب پارے کا مطمع نظر بناتا رہتا ہے۔ فنون لطیفہ در حقیقت سماج

کی مہذب قدروں کو ترتیب میں لا کر نکھار پیدا کرتے ہیں۔ عالمی ادبیات میں تغیر اور ترقی کا متحرک عمل ہمیشہ سماج اور اس کے اجتماعی زندگی کے پہلو رہے ہیں۔ کوئی بھی فن کار ہو وہ ہمیشہ ایک خاص رویے کے حامل معاشرے میں جنم لیتا ہے۔ بلکہ وہ اس کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ اس فن کار کے کام میں ایک طے شدہ کردار اس کے سماج کا ہوتا یعنی اگر ادیب کیلئے سازگار تخلیقی فضا سماج مہیانہ کرے تو اس فن کار یا ادیب کا تخلیقی عمل نمو نہیں پا سکتا اور اس کی تخلیقی صلاحیتں بے کار ہو جاتی ہیں۔ سماج کا ہر زاویہ ادب کے موضوعات کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔ کیونکہ ادب در حقیقت ایک سماجی عمل کا نام ہے۔ لہذا فن کار یا تخلیق کنندہ کا فریضہ ہے کہ وہ سماج کی حقیقی اور کامل منظر کشی کرے۔

> ''ادب سماجی عمل ہے۔ اسے سماج کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے، اسے سماج کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ وہ سماج کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور خود آگے بڑھ کر سماج کو اپنے ساتھ آگے بڑھاتا ہے۔ وہ سماج کا عکس اسے دکھاتا ہے۔ عکس دکھا کر اسے اس کی خامیوں سے متنبہ کرتا ہے۔۔۔ ان خامیوں کو دور کر کے سماج کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے بڑھاتا ہے اور خود بھی اس کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔''(۱۴)

سماج میں زندگی جو کھیل، کھیل رہی ہے اس کی جوں کی توں عکاسی یا ضبط تحریر میں لانا ادب کے فرائض میں داخل نہیں بلکہ جو کچھ سماج میں ممکن ہے یا جس کا سماج میں صدور ہو سکتا ہے۔ ادب اسے اپنے موضوعات کے حصار میں لانے کی سعی کرتا ہے۔ ادب سماج کے تغیرات کا جزو بن کر اپنا وجود تحلیل نہیں کرتا بلکہ ان تغیرات میں خود کو زندہ رکھ کر انہیں بدلنے کا وسیلہ تلاش کرتا ہے۔ ادبی تخلیقات میں اغراض جس قدر پوشیدہ ہوں گیں فن اتنا ہی عظیم سمجھا جائے گا۔ تاریخ اور تہذیبی عمل اپنی آغوش میں ادبی روایات کی صورت گری کرتے ہیں۔ انہیں قبول عام بخشنے کیلئے سماجی ارتقاء اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ادب، سماج کے مسائل سے آنکھیں موندلے گا یا سماج کی روشن حقیقتوں کی صورت گری نہیں کرے گا تو ایسا ادب مردہ جسم کے مانند تصور ہوگا۔ ادب کی تخلیق اس کے اپنے سماجی ماحول سے مطابقت رکھتی ہے۔ ادب پارہ تب حقیقی وجود حاصل کر پاتا ہے جب فن کار اور سماج کا ایک دوسرے کے ساتھ عمل اور رد عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ سماجی رویے کے رد عمل کے نتیجے میں فن کار یا ادیب کا قلم چلتا ہے۔

تب کوئی بھی تخلیق کار اپنے باطنی تجربات، تخیلات اور افکار سے خارج کو جبکہ سماج میں پیش آنے والے اجتماعی تجربات و گمان وغیرہ تخلیقیت کے داخل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادب اپنے سماج کی واشگاف حقیقتوں کا عکاس اور

معاشرتی تلخ و شیریں ہر طرح کے رویوں کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔ڈاکٹر حسرت کا سگنجوی تشکیل معاشرہ کی خوبصورت شکل، سچائی کو ایک اہم جزو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب کا بنیادی عنصر سچائی ہے۔ادب کیونکہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اس طرح ادب کے ذریعے ہمارے سامنے زندگی کی تمام تر حقیقتیں اور سچائیاں ہوتی ہیں۔ سچائی ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ہے اس لیے ادب براہ راست ایک بہتر معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کرتا ہے۔''(۱۵)

زندگی ہو یا ادب ان کا نقطہ ارتکاز انسان اور انسان سے وقوع پذیر ہونے والے معاملات ہوتے ہیں۔انسانی حیات گوں نہ گوں جذبات اور احساسات سے عبارت ہے۔ادب بلاواسطہ زندگی اور اس کے معاملات سے مدمقابل ہو کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتا ہے۔ سماج کا ارتقا و فلاح کا بہترین ذریعہ بھی ادب ہے کیونکہ وہ سماج سے ہی اثرات قبول کرتا ہے پھر وہی ادب زندگی اور سماج پر اپنے اثرات قائم کرتا ہے۔ادب چاہے جس ادبی صنف میں ہو وہ کسی نہ کسی زاویے سے اپنے سماج سے منسلک ہوتا ہے۔ادب زندگی کے حوالے سے اپنے آپ میں وسیع معنویت رکھتا ہے۔ادب کا براہ راست تعلق زندگی اور اس کے رویوں سے ہوتا ہے۔ادیب اپنی تخلیقات میں ہمیشہ اپنے سماج کے اور سماجی زندگی کے تجربات و مشاہدات بیان کرتا ہے۔کیوں کہ ادیب افراد معاشرہ سے زیادہ باشعور ہوتا ہے۔وہ زندگی سے حقائق کشید کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔اپنی قوت فکر سے زندگی کے تجربات بیان کر کے کہ کوئی بھی ادیب سماجی زندگی کے نشیب و فراز آگاہ کرتا ہے۔ادیب سماجی رویوں کا نباض ہوتا ہے وہ پردوں میں لپٹی ہوئی زندگی کو اس پار تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ایک اچھا ادب زندگی کا شعور دیتا ہے، زندگی کی اصل حقیقتوں تک رسائی کی قوت بخشتا ہے۔یہ امر بھی انتہائی لازم ہے کہ زندگی کے حقائق کے ادراک کیلئے سماجی کیفیتوں کا بنظر غائر معائنہ کرنا پڑتا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب سماجی زندگی سے علیحدہ نہیں ہوتا۔سماج، سیاست، معاشرت، مذہب اور اس کی زندگی میں روزانہ کی بنیاد پر صادر ہونے والے تمام واقعات کا ادیب کی ذات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔اس لیے یہ ممکنات میں سے نہیں ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر اپنی ادبی تخلیقات میں سماج اور زندگی کی منظر کشی نہ کرے۔بقول اختر حسین رائے پوری:

> ''میری ناچیز رائے میں کسی ادب کی روح کو سمجھنے کے لیے اس فضا کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔اس لیے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنے فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔اس کی زبان میں اجتماعی انسان بول رہا ہے۔''(۱۶)

ادب برائے ادب ایسی تخلیقات کا نام ہے جو انسان کے قلب و ذہن کو تلذذ فراہم کرتی ہیں۔ایسا ادب جب قارئین کی نظروں سے گزرتا ہے تو ان کے لیے یہ محض باعث حظ بن جاتا ایسے فن پارے کا زندگی کے حوالے سے کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ایسا ادب پارہ صرف اور صرف طبعیت کو محظوظ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ادب برائے ادب میں ادبی تخلیقات کا زاویہ خارج سے داخل کی سمت ہوتا ہے۔جوار دو ادب میں ادب برائے ادب کی متعدد نظیریں ہیں۔تاہم حلقہ ارباب ذوق کا ابتدائی بیس سالہ عہد تحریکی اعتبار سے اس ادبی نوع کیلئے ایک تابندہ مثال ہے۔ادب برائے ادب ایسے ادب کو بھی کہتے ہیں جو راحت و تسکین کا سبب بنے جس کے پڑھنے سے مزا حاصل کیا جائے۔حلقہ ارباب ذوق کے ادباء کا نظریہ یہ تھا کہ کسی بھی فن پارے کی جانچ کرتے ہوئے اولاً اس چیز کا مشاہدہ کیا جائے کہ وہ ادب پارہ ادبیانا اقدار اور ادب کے متنوع فنی اور جمالیاتی معیارات سے کس سطح کی یکسانیت رکھتا ہے۔فنی وادبی معیار ہی کسی فن پارے کی قدر و منزلت کا تعین کرتے ہیں۔مزید برآں زندگی کے بارے میں تمام انسان مختلف نقطہ نظر رکھتے ہیں۔اس کے نظریات میں ان کا نقطۂ نظر اکثر و بیشتر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔یہی نظریاتی پہلو فن کار کے فن پاروں میں یکتائی پیدا کرتا ہے۔یہ ادب پارہ اپنے تخلیق کار کی ترجمانی کرتا ہے۔اس لیے اس ادب پارے میں اس تخلیق کار کا ذاتی نقطہ نظر زیادہ لائق التفات ہوتا ہے۔بقول شہرت بخاری:

> ”اس جماعت نے اپنا مسلک یہ طے کیا کہ ادب کو اول و آخر ادب ہونا چاہیے۔نقطہ نظریا عقیدے سے بحث بے معنی ہے۔زندگی مختلف متنوع عوامل اور کیفیات سے عبارت ہے۔ہر شخص اپنی جگہ ایک اکائی ہے۔ہر فن کار زندگی اور اس کے متعلقات کے سلسلہ میں جو بھی رویہ رکھتا ہے وہ اس کے ذاتی ماحول اور عوامل کا آئینہ دار ہے۔یوں جو ادیب کوئی ادب پارہ تخلیق کرتا۔ہے وہ اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔“(۱۷)

ادب زندگی کے ہر رویے کی عکاسی کرتا ہے۔سماج کے تمام حقائق اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے ہر تغیر کو سب کے روبرو لانے میں ادب اہم ذمہ داری. انجام دیتا ہے۔کوئی ادیب اپنے سماج سے لا تعلق ہو کہ ارفع ادب کا خالق نہیں بن سکتا۔اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ادب اور زندگی ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔

ایک حقیقی ادیب جب اپنے بارے میں خامہ فرسائی کرتا ہے تو بھی اپنے عہد اور تہذیبی رویوں کی منظر کشی کرتا ہے۔بسا اوقات ادیب کے نظریات میں ادب زندگی کا ایک خوبصورت اور انوکھا زاویہ پیش کر رہا ہو رہتا ہے۔ادیب اپنا تشخص ضرور رکھتا ہے تاہم وہ سماج کا ہی حصہ ہوتا ہے۔وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اپنے سماج سے

جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ادیب کی حساسیت اگر گہری ہو تو اس کا سماج کے ساتھ تعلق اور وابستگی اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یوں ایک ادیب کی ذاتی رائے بھی سماج کے معاملات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ بقول آل احمد سرور:

> "ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے عہد اور ماحول سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ سماج کو ترقی کے راستوں پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ ادب اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر بھی غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔"(۱۸)

ادب اپنی خصوصیات کی بنا پر زندگی اور سماج کے حالات و واقعات کا حقیقی ترجمان ہے۔ یہ براہ راست اور بالواسطہ دونوں جہتوں سے زندگی جینے کی جرات عطا کرتا ہے۔ ادب اپنے جمالیاتی یا کسی فنی خوبی کی نمائندگی کر بھی رہا ہو تب بھی ادب زندگی اور سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو سمو رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ادب کا قاری اپنی ادبی تخلیقات کی شکل میں سماجی تغیر کے عکس دیکھ رہا ہوتا ہے، پھر ان تغیرات سے سماج کے افراد کو آشنا کر رہا ہوتا ہے۔ الغرض ادب زندگی کی حقیقتوں کو اور سماج کے تغیرات کو اپنے اندر جذب کر کے افراد معاشرہ کو زندگی اور سماج کا درست شعور عطا کرتا ہے۔ ادب کسی امتیاز کے بغیر سفر زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے حصار میں لے کر سماج اور زندگی کو ایک بیانیہ کی شکل عطا کرتا ہے۔

ج: مزاحمت کے مبادیات

انسان اور انسانی معاشرہ ابھی منصۂ شہود پر جلوہ گر نہ ہوا تھا مگر خیر اور شر کا تعارف اس سے بھی پہلے ہو گیا۔ تخلیق آدم کے وقت جب رب کائنات نے تخلیق انسانی کا تذکرہ فرشتوں کے سامنے فرمایا تھا کہ میں زمین پے اپنا نائب/ خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے فوراً انسان کے شر اور فساد کا تذکرہ کر کے مزاحمت کی بنیاد رکھ دی۔ تخلیق آدم کے بعد پہلی انسانی مزاحمت آدمؑ کے شجر ممنوعہ کے پھل کھانے، دوسری مزاحمت ہابیل اور قابیل کے معاملے کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ انسان جس بھی ماحول میں رہتا ہے اس ماحول کے تمام پہلو اس کی ذات، افکار اور نظریے کے موافق نہیں ہوتے جب یہ ناموافق عناصر انسان پر ہر سمت سے اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو انسان اپنی فطرت کی بنا پر ان ناموافق عناصر سے ٹکرا جاتا ہے اسی کا نام مزاحمت ہے۔ مزاحمت کی بنیاد حساسیت ہے۔ جب محسوسات کسی چیز سے مضطرب ہوں تو ایسی چیز سے انحراف واختلاف کرتے ہوئے ناگواری کی بلندی کو پہنچنے لگتے ہیں۔ اس تمام عمل کے پیچھے مزاحمت کا ہی عمل دخل ہوتا ہے۔

مزاحمت عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کا مادہ اشتقاق عربی زبان کا لفظ ''زحمہ'' ہے۔زحمہ کے معنی اپنے مخالفت کے مدمقابل ہونا یا دفاع کرنے کے ہیں۔انگریزی میں مزاحمت کے لیے ''Resistance'' کا لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔مختلف لغات میں لفظ "مزاحمت" کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔

فرہنگ عامرہ میں مزاحمت کے معنی ''کسی پر تنگی کرنے کے ہیں''۔(۱۹) فرہنگ آصفیہ میں اس کا مطلب ''تعرض ، اٹکاؤ، ممانعت اور روک ٹوک ہے''۔(۲۰) پروفیسر کلیم الدین احمد نے انگریزی اردو لغت میں Resistance کیلئے ''مقاومت، مخالفت، مدافعت یا رکاوٹ استعمال کیا ہے''۔(۲۱)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے Resistance کے لیے ''مقاومت ، مخالفت، مدافعت یا رکاوٹ استعمال کیا ہے۔''(۲۲)

انگریزی لغت Collins Cobuild میں Resistance کی تعریف یوں بیان کی گئی

> "The act of refusing to accept something such as change and trying to prevent it from happening."(23)

فیروز اللغات میں مزاحمت کے معنی ''روک ، ممانعت اور تعرض ہیں''۔(۲۴) نور اللغات کے مطابق ''رکاوٹ پیدا کرنا، مداخلت کرنا ہے''۔(۲۵) درسی اردو لغت میں مزاحمت کے معنی ''روک ٹوک، اٹکاؤ اور ممانعت ہیں''۔(۲۶) فرہنگ تلفظ میں اس سے مراد ''رکاوٹ اور مخالفت ہے''۔(۲۷) آکسفورڈ امریکن ڈکشنری میں Resistance کی تعریف یوں بیان کی گئی:

> The refusal to accept or comply with some things, the attempt to prevent something by action or argument.(28)

مزاحمت سے قریب کا لفظ احتجاج ہے۔انگریزی میں احتجاج کا متبادل لفظ Protest ہے معروف انگریزی لغت Collins Cobuild میں protest کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

> The act of saying or showing publically that you object to some thing that someone, especially in authority , it doing or intending to do.(29)

کلیم الدین احمد نے اپنی لغت میں احتجاج کے معنی ''عذر، اعتراض یا اظہار ناراضی کے پیش کیے ہیں۔''(۳۰)

''احتجاج اس جذبے اور خیال کو کہتے ہیں، جو انسان کے دل و دماغ میں کسی کے خلاف پیدا ہوتا ہے''۔(۳۱)

انسان کا خمیر جذبات و احساسات سے گوندھا گیا ہے۔ وہ کسی بھی سماجی رویے کو اس کے معیار کے مطابق جذباتی سطح پر پرکھتا ہے اور اسی حساسیت کی بنا پر اس کے بارے میں اپنا ردعمل دیتا ہے۔ یعنی اچھے رویوں پر تعمیری ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے جبکہ برے رویوں کے ردعمل میں مزاحمت یا احتجاج کا اظہار کرتا ہے۔ معاشرتی ناہمواریاں سماج کے افراد پر ہمیشہ برے اثرات ڈالتی ہیں، سماج کے افراد ان کے خلاف مختلف انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ جذبات کبھی مزاحمت کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور کبھی احتجاج کے رنگ میں نظر آتے ہیں۔ لہذا مزاحمت اور احتجاج اپنی ساخت اور استعمال کے لحاظ سے کافی قربت رکھتے ہیں۔ کچھ ادباء مزاحمت اور احتجاج کو مترادف المعنیٰ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ مزاحمت اور احتجاج اپنی ہیئت اور استعمال کے سبب باہم قرب تو یقینا رکھتے ہیں مگر ہم معنی نہیں ہیں، ان دونوں کے درمیان لطیف سی تفریق ہے۔ مزاحمت اور احتجاج ہر عہد میں با اعتبار نوعیت ایک دوسرے علیحدہ رہے ہیں۔ ان میں قدر مشترک صرف اتنا ہے کہ جتنی سماج میں جبر کی اقسام پائی جاتی ہیں اتنی ہی اقسام مزاحمت اور احتجاج کی موجود ہیں۔ یہ جابرانہ، استحصالی رویے کسی کے بھی خلاف ہو سکتے ہیں، چاہے وہ نظام زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو۔ سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی، تاریخی و ادبی جابرانہ رویے ہوں ان کے خلاف ہمیشہ آواز بلند ہوتی رہی ہے۔ ادیب یا شاعر سماج کے عمومی افراد سے زیادہ حساسیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بے شمار قدغنوں کے باوصف وہ اظہار جذبات کے انوکھے انداز اپنا لیتے ہیں۔ رمزیہ علامتوں کنائیوں اور مختلف ادبی صنعتوں کے وسیلہ سے یا بلاواسطہ اپنے احتجاج کا اظہار کرتے ہیں۔ شعراء اور ادباء اپنے ماحول کے ہمہ قسمی پہلوؤں پر عقابی نظر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عہد میں ہونے والے جبر و استبداد کے تمام زاویوں کے شناسا ہوتے ہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی مفاد پرستی اور استحصالی رویوں کے خلاف قلم اٹھا کر جب اپنی ادبی تخلیقات میں ناآسودگی کا اظہار کرتے ہیں تو اسی کو ہی ادب میں اختلاف اور احتجاج کا معنی دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اپنے مضمون "ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت" میں لکھتے ہیں۔

> "حساس ادیب جب اپنے کسی معتبر تجربہ کو اظہار کی شکل دیتا ہے ہے تو گویا وہ ایک اختلافی یا انحرافی عمل سے گزرتا ہے۔ وہ بلاشبہ کسی سماجی یا انسانی صورت حال کے بارے میں اس اعتماد سے اپنی بات کہتا ہے کہ اس میں کچھ نیا ہے اس میں دوسروں کی سوچ یا علم و آگہی سے ہٹ کر کچھ کیا گیا ہے۔ یعنی اس کا تخلیقی تجربہ دوسروں سے اختلاف کا پہلو رکھتا ہے۔ معاصرین کے عالم طرز فکر سے وہ ایک گریز یا انحراف ہے، دوسری جانب اس انحرافی رویئے میں اکثر احتجاج کا جذبہ اس لیے شامل ہوتا ہے کہ ادیب اپنے ماحول اور معاشرے سے ناآسودہ ہوتا ہے۔ اظہار کے وسیلہ سے وہ اپنی ناآسودگی کے اضطراب اور کرب کا اظہار کرکے ایک سکون پاتا ہے۔ ادب میں انحراف اور احتجاج کا تیسرا پہلو یہ

> ہے کہ اس طرح ادیب اپنے وجود کو جتاتا ہے، اس کا اثبات کرتا ہے، اپنی انفرادی پہچان یا اپنے تہذیبی تشخص کی جستجو کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں اس صورت سے وہ اپنی آزادی اظہار کا اعلان کرنے جمہوری عمل کو بھی استحکام بخشتا ہے''۔(۳۲)

تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی سماج مختلف نظام ہائے زندگی کی زد میں رہا ہے۔ یہ نظام اگر تعمیری حیثیت کے حامل ہوتے تو تخریبی طاقتیں اس کے خلاف مزاحمت کار اور احتجاج کنندہ ہوتی تھیں۔ اگر یہ نظام تخریبی کیفیات کے حامل ہوتے تو باشعور اقوام اس راہ میں مزاحم اور سراپا احتجاج ہو جاتی تھیں۔ مزاحمت کسی بھی نظام، ارباب حکومت اور اس کی سماج دشمن پالیسیوں کے خلاف ہو سکتی ہے۔ مگر احتجاج کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ضروری نہیں کہ ناگفتہ بہ حالات میں کسی کو نقصان پہنچے۔ عام حالات میں بھی نادار اور کمزور لوگوں کی املاک اکثر استحصالی نظام کی زد میں آجاتی ہیں۔

> ''مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے۔ اسی طرح مزاحمت بنیادی طور پر ایک انقلابی سرگرمی ہے۔ اس کے برعکس احتجاج کی اصطلاح میں ایک سے زائد تجربے اور اس کی توانائی کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ گویا احتجاج اور مزاحمت کے درمیان فرق یہ ہے کہ احتجاج روائیتی طور پر منصوبہ بند، منظم، منضبط، شعوری اور اجتماعی ہوتا ہے۔ دوسری جانب مزاحمت غیر منصوبہ بند، غیر منظم، غیر شعوری انفرادی عمل ہے۔''(۳۳)

سماج میں وقوع پر پر ہونے والی کسی بھی ناانصافی کے خلاف سب سے پہلے سماج کے افراد میں مزاحمت جنم لیتی ہے۔ جب مزاحمتی جذبات عروج پکڑتے ہیں تو اپنے اظہار کیلئے احتجاج کا رنگ اپناتے ہیں۔ یہ احتجاج کبھی وقتی ہوتا ہے تو کبھی طویل جدوجہد کی بنیاد بن جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ احتجاج دو کیفیتوں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ احتجاج کامیاب ہو تو انقلاب اگر ناکام ہو تو بغاوت کہلاتا ہے۔ احتجاج اور انقلاب دونوں باہم منسلک ہوتے ہیں کیونکہ انقلاب کی بنیاد منظم احتجاجی رویے ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب تب تک عملی سانچے میں نہیں ڈھلتا جب تک اس میں تنظیم اور قوت نہ ہو یا باقاعدہ تحریک کے روپ میں برپا نہ ہو۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ احتجاج انقلاب کا پیش خامہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید احتجاج، بغاوت اور انقلاب کا باہمی تفاوت اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''انقلاب کیلئے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی باقاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انقلاب کیلئے انقلابی شعور ہونا لازمی ہے جب کہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا ردعمل ہو سکتا ہے۔ مثلاً

اگر کوئی شخص کسی تحریک کا مخالف ہے تو اس کی یہ مخالفت کسی طرح کسی حکمت عملی کو جنم نہیں دیتی بلکہ ایک طرح کی ذہنی بغاوت کی موجب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ احتجاج کسی بھی شعبے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ ہموار نہیں کرتا۔۔۔ جس طرح انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے ویسے ہی بغاوت اور احتجاج بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم یا رواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جا سکتا۔ خواہ اس کی راہ انقلابی ہو یا جذبات کا وقتی ابال جو رومانوی اثرات سے پر ہو، جب کہ احتجاج کسی شے سے لاتعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی کسی ناپسندیدہ شے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔" (۳۴)

مزاحمت، احتجاج اور انقلاب معنوی پہلو سے باہمی قربت رکھتے ہیں لیکن اصولی طور پر ان کے مفہوم میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ادبی تخلیقات میں یہ تینوں اصطلاحات ایک دوسرے کے جگہ پر متبادل کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہیں اور ان اصطلاحات کی تاویلات یقیناً وہی ہیں۔ کسی بھی سماج میں جب استحصالی رویے جنم لیتے ہیں ان کے خلاف یقیناً مزاحمت اور احتجاج بھی وجود میں آتے ہیں۔ جہاں مزاحمت اور احتجاج کے، احتجاج کارفرما ہوں وہاں تغیرات کا معرضِ وجود میں آنا ایک لازمی حقیقت ہے۔ جب کسی سماج میں منصفانہ مساوات کے ساتھ معتدل انداز میں سماج کے افراد کو بنیادی حقوق فراہم نہ کیے جائیں تب تک مزاحمت، احتجاج اور انقلاب کی شکل کسی نہ کسی طرح سماج میں زندہ رہے گی۔ غیر منصفانہ رویوں کے خلاف مزاحمت، احتجاج اور انقلاب سماجی زندگی کے اختتام تک قائم رہیں گے۔

د: ادب میں مزاحمت کی روایت

ہر ذی روح جذبات و احساسات کی مٹی سے تخلیق ہوا ہے۔ اگر اس کے جذبات و احساسات کو محبت و شفقت کی بھرپور صورت میسر آتی ہے تو وہ باخوشی دوسروں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اس کے برعکس اگر جذبات و احساسات پر ناگوار رویوں کے تازیانے پڑیں انسان تو کیا جانور بھی ان رویوں کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جانور اپنے ردعمل کو عملی مزاحمت کے روپ میں پیش کرتا ہے جبکہ انسان عملی صورت کے ساتھ ساتھ تحریر کی شکل میں بھی سامنے لاتا ہے۔ یہی مزاحمت کی تحریری شکل مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ مزاحمتی ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ تخلیق ادب کی ابتداء۔ جب سے انسان نے تحریر کی صورت میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنا سیکھا تب سے مزاحمتی ادب کا بھی آغاز ہوا۔ ادب کا تخلیقی عمل اس وقت فن کار میں جنم لیتا ہے جب اس کی ذات میں مزاحمت کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی ادب" میں لکھتے ہیں:

> ''ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد و پیش سے Confirm نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔''(۳۵)

جب کوئی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کسی بھی ناجائز رویے کا مشاہدہ اپنی ذات یا اپنے سماج سے کرتا ہے تو وہ اس برتاؤ کے خلاف مقدور بھر اپنا ردعمل دیتا ہے تو وہ بھی مزاحمتی ادب اسی بنیاد پر تخلیق کرتا ہے۔جب ادیب انفرادی یا اجتماعی استحصالی رویوں کا غائر نگاہوں سے جائزہ لیتا ہے تو معاشرے میں ہونے والے استحصالی قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ معاشرے کو اس ظلم و ناانصافی کیخلاف اکساتا ہے۔ در حقیقت ادیب معاشرے کا نباض اور معاشرے کے تمام رویوں کو گہرائی سے پرکھنے کا ملکہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی حساسیت، شعور اور قدرت کلام کی بنا پر مزاحمتی ادب تخلیق کر کے ان غیر مقبول سماجی رویوں کے خلاف سماج کے افراد کو شعور بخشتا ہے۔ادیب یا مزاحمت کار سماج کا سب سے زیادہ حساس، لطافت خیال کا مالک اور باشعور ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''مزاحمتی ادب ہمیشہ شعوری کاوش کا نتیجہ اور انسانی جدوجہد کے مثبت رخ کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں اسیر معاشرے کے باشعور فنکار کی مصلحت سوزی، باآواز بلند حق کی گواہی اور آنے والے کل کو اجلا اور روشن بنانے کے خواب کا اعتبار پیدا کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔۔۔ ہر باشعور یا باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی ہر صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔''(۳۶)

اردو ادب میں مزاحمت کی ابتدا

عالمی سطح پر قرطاس کی زینت بننے والی تمام زبانوں میں مزاحمتی ادب کی ایک طاقت ور روایت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی لغت رکھنے والی زبان مزاحمتی ادب سے خالی نہیں ہے۔ جیسے دیگر زبانوں میں مزاحمتی ادب کی روایت موجود ہے اسی طرح اردو ادب بھی مزاحمت کے مختلف پہلو رکھتا ہے۔اردو ادب کی مزاحمتی روایت کی ابتدا مغل سلطنت کے اختتامی دور سے جنم لیتی ہے۔تاج برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے تجارتی کمپنی قائم کر کے اس کی آڑ میں برصغیر کے طول و عرض پر تسلط جمانے کے لیے اس کی لگاتار کوشش نے اس عہد کو زیروزبر کر ڈالا۔

ڈاکٹر رشید امجد اس دگرگوں عہد کی سیاسی و سماجی کیفیات کا منظر نامہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے کہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی و تہذیبی زوال کا عہد ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی اور یہ زوال بنیادی طور پر سیاسی انحطاط کا نتیجہ تھا۔"(۳۷)

مزاحمت ہمیشہ کمزور کا خاصہ رہا ہے۔ مزاحمت محض تحرک یا تغیر کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی غیر آئینی رویے کے خلاف ہوتی ہے۔ مزاحمتی قوتیں ہمیشہ استحصال اور سامراجیت کے خلاف بر سر پیکار رہتی ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے عہد زوال میں سماجی انتشار اپنے عروج پر تھا۔ کوئی بھی قوم تبھی زوال پذیر ہوتی ہے جب وہ اپنے سماج کو غیر مطمئن حالات سے دوچار کرتی ہے۔ اس عہد میں جعفر زٹلی نے اپنے سماج میں برپا ہونے والے ناموافق سماجی حالات کی بے باک الفاظ میں منظر کشی کی۔ ہجو یہ نظم کو بطور مزاحمتی ہتھیار استعمال کرتے ہوئے فرخ سیر کی معاشی پالیسوں کے خلاف اور مہنگائی کے معاملے پر مزاحمتی شعر تخلیق کیا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ تسمہ کش فرخ سیر (۳۸)

مزاحمتی ادب کی تخلیق میں شعراء کے ساتھ ساتھ ادباء نے بھی پوری طاقت سے اپنا حصہ ڈالا۔ خاص کر اردو افسانوی ادب میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سماج دشمن عناصر کے خلاف پہلی چوٹ بن کر قہر ڈھانے والی افسانوی تخلیق "انگارے" قابل ذکر ہے۔ جس کی اشاعت نے سامراج کے بڑے بڑے برج الٹ دیے اور انہوں نے اس افسانوی مجموعہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اسے صفحہ ہستی سے ناپید کرنے کی بھرپور تگ و دو کی۔ "انگارے" نے آنے والے وقتوں کیلئے ہمہ قسمی مزاحمتی ادب کیلئے نئے جہانوں کے دروازے کھولے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد رقمطراز ہیں:

"بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اردو ادب ایک انقلاب آفریں رویے سے آشنا ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے سوچ کا زاویہ ہی بدل دیا۔ اردو افسانے میں "انگارے" کی صورت میں جرات اظہار نے جنم لیا اس کا اثر بالواسطہ شاعری پر بھی پڑا۔"(۳۹)

قیام پاکستان کے بعد تو یہ مزاحمتی عمل ادبی تخلیقات میں شدت سے داخل ہو گیا۔ فیض احمد فیضؔ، حبیب جالبؔ اور دیگر ممتاز شعراء مطلق العنانی غیر جمہوری رویوں اور ڈکٹیٹر حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کی اور توانا آواز بن کر سامنے آئے۔ فیضؔ نے مزاحمتی شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ فیضؔ پرواز تخیل کی خلانوردیوں کے حوالے سے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے ماحول کے حقائق کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر شاعرانہ آہنگ عطا کیا۔ فیضؔ کی شاعری

نے جدید دنیا کے ہمہ قسمی جابرانہ رویوں کے خلاف اپنا طاقت ور ردعمل پیش کیا۔ فیضؔ نے صرف حسن و عشق کی شاعری ہی نہیں کرتی بلکہ سیاسی، سماجی اور استحصالی رویوں کے خلاف مضبوط مزاحمت کار کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ ان کی شاعری سماج کے پسماندہ اور جبری رویوں کے شکار افراد کا نوحہ ہے۔ جس میں وہ سماج کے ہر پہلو سے جڑے ناپسندیدہ عناصر پر اپنے قلم سے تاک کر حملہ کرتے ہیں۔ ایسا انداز صرف اور صرف حقیقی مزاحمتی شاعری میں ہے، جس میں فیضؔ کو کمال حاصل تھا انکی نظم "بول" کے کچھ اشعار دیکھئے:

بول، کہ لب آزاد ہیں ترے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے (۴۰)

مزاحمتی شاعری کے میدان میں حبیب جالبؔ ایک طاقت ور مزاحمتی آواز کے مالک تھے۔ جالبؔ سے قبل اکثر شعراء نے مصلحت پسندی کے سبب واشگاف الفاظ میں اظہار مطلب کرنے کی بجائے علامتی انداز اپنایا۔ مگر جالبؔ نے اپنی مزاحمت میں مصلحت آمیزی اختیار نہیں کی وہ بابانگ دہل اپنے مزاحمتی جذبات کا لفظی اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کے سبب اس دور کے طالع آزما اور مفاد پرست حکمرانوں نے انہیں بار بار پابند سلاسل کیا لیکن حبیب جالبؔ اپنے نظریات پر اٹل رہے۔ کسی بھی طرح کے سامراجی ہتھکنڈوں کے سامنے اپنا سر خم نہ کیا اور معاشرتی جبر کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔ ہر ظلم و جبر کو محروم طبقے کے خلاف انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا۔ ان کی شاعری پسماندہ اور محروم طبقے کی ترجمان ہے۔

شہر ویراں اداس ہیں گلیاں
راہگزاروں سے اٹھ رہا ہے دھواں
آتش غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رخ دوراں
صبح بے نور شام بے مایہ

لٹ گئی دولت نگاہ کہاں(۴۱)

معلوم تاریخ ہمیں اس بات کا ادراک مہیا کرتی ہے کہ انسان اپنے سماج میں مختلف افراد سے مختلف رویوں کا شکار رہا ہے۔ یہ رویے مثبت اور منفی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ جس سماج میں مثبت رویے غالب ہوتے ہیں وہ سماج امن و آشتی کا نمونہ ہوتا ہے۔ جہاں منفی رویے تسلط پذیر ہوں وہاں سماجی بے چینی اور افراتفری کا ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ انسان فطری طور پر حریت پسند ہے جابرانہ اور استحصالی عناصر کے خلاف برسرپیکار ہو کر عملی مزاحمت کی کوشش کرتا ہے -مزاحمت مختلف عناصر کے خلاف مختلف صورتوں میں ہوتی ہے، یہی کیفیت انسان کے سماج میں مزاحمتی عناصر کی تخلیق کرتا ہے۔ جبر کے جتنے بھی پہلو سماج میں فرد کو پیش آتے ہیں مزاحمت کے اتنے ہی رویے وجود میں آتے ہیں۔ یہ مزاحمت بسا اوقات انفرادی صورت میں جنم لیتی ہے اور کبھی اجتماعی کیفیت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

انفرادی مزاحمت: انسان بے شک ایک سماجی جاندار ہے مگر اس کی زندگی کے تمام پہلو سماج سے منسلک نہیں ہوتے بلکہ بعض معاملات کا تعلق اس کی انفرادی شخصیت سے ہوتا ہے۔ جب سماج میں کسی فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے لحاظ سے ظلم و جبر یا سامراجی رویے کا سامنا کرنا پڑے تو وہ اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کیلئے مزاحمت کرتا ہے۔ بعض اوقات فرد کو اپنے گرد و پیش سے خطرات کا سامنا رہتا ہے۔ جب اسے اپنے ہی جیسے انسانوں سے دشمنی اور جبر سہنا پڑے تو اپنے تحفظ کیلئے عملی مزاحمت کے اقدامات اٹھاتا ہے۔ انسانی معاشرے کی پہلی انفرادی مزاحمت حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کے درمیان ہونے والی مخاصمت ہے۔ تبھی سے نسل انسانی میں کشت و خون کی ابتدا ہوئی، یہ تسلسل ہنوز قائم ہے۔ عہد ہائے قدیم میں جب انسان ظالم و جابر لوگوں کے غلام کی صورت میں ہوتے، تو وہ بے رحم آقا اپنے غلاموں پر ظلم و جبر سے عرصہ حیات تنگ کر دیتے تھے۔ نتیجتاً وہ غلام اپنے اس آقا کے خلاف مزاحمت کرتا یہی انفرادی مزاحمت کہلاتی ہے۔

اجتماعی مزاحمت: سماج کے اکثر و بیشتر افراد باہمی اتفاق کے ساتھ کسی طاقتور، ظالم جابر اور استحصالی قوت کا مقابلہ کریں تو مزاحمت کی اجتماعی صورت کہلاتی ہے۔ جب کوئی سماج کو اپنی استعماریت کے پنجے میں دبوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو پورا سماج اس استعمار کے خلاف اپنے حقوق کی پاسبانی کیلئے نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ کیونکہ استعماریت کبھی فرد واحد کو اپنا ہدف نہیں بناتی بلکہ اس کی زد میں پورا سماج ہوتا ہے۔ فرد واحد کبھی بھی استعماریت کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے اجتماعی مزاحمتی قوت درکار ہوتی ہے۔ اجتماعی مزاحمت کے مقاصد مشترک ہوتے ہیں:

> ”اجتماعی مزاحمت بہت سے افراد جو، ظلم و ستم کا اکٹھے شکار ہوں، مل کر کرتے ہیں۔
> اجتماعی مزاحمت کیلئے ضروری ہے کہ بہت سے افراد کسی ظلم کی اجتماعی شکل کو پہچانیں۔

آپس میں یک جہتی محسوس کریں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ یہ ظلم سب کے خلاف ہے۔"(۴۲)

اجتماعی مزاحمت کی ایک واضح مثال بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں فرعون کے خلاف مزاحمت کرنا۔ نبی آخرالزمانﷺ کی سربراہی میں لڑی جانے والی پہلی جنگ غزوہ بدر اسلامی تاریخ کی پہلی باقاعدہ اجتماعی مزاحمت کی مثال ہے۔اس کے بعد تمام غزوات اسی اجتماعی مزاحمت کا تسلسل ہیں۔ مسلمان اجتماعی مزاحمت سے نہ صرف اپنے دین کی ترویج واشاعت کیلئے کامیاب رہے بلکہ اپنی سماجی زندگی کو اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق بسر کرنے کیلئے ایک علیحدہ مستقل اور آزاد ریاست بھی قائم کر پائے یہ اجتماعی مزاحمت کبھی ثقافتی یلغار کے مدمقابل ہوئی، کبھی سیاسی تو کبھی نو آبادیاتی استعماری نظام کے خلاف جدوجہد کرتی نظر آتی اس کا ایک واضح مقصد اپنے سماج میں مطلوبہ انقلاب لانا ہوتا ہے جو سامراجی، استحصالی اور آمرانہ قوتوں سے نجات دلا کر ایک مطمئن سماجی زندگی عطا کرے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے کچھ عرصے بعد مسلمانان برصغیر نے اجتماعی مزاحمت سیاسی وسماجی تنظیمات پلیٹ فارم سے کی۔اس اجتماعی مزاحمت کو تب نصب العین ہاتھ آیا جب انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر قائداعظم محمد علی جناح کی مدبرانہ قیادت میں منتخب ہو کر سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے حصول کیلئے بے مثل اجتماعی مزاحمت کی اور برصغیر کے طول وارض پر ایک لازوال انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔اپنی جداگانہ حیثیت کالوہا منواتے ہوئے اپنے لیے ایک علیحدہ ملک کا قیام عمل میں لائے۔ مزاحمت کئی طرح کے عناصر کے خلاف ہوتی ہے۔ہر طرح کے خلاف ہونے والی مزاحمت کے انداز بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ان میں سے چند عناصر حسب ذیل ہیں۔

i ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت

ii سماج میں تخریبی عناصر کے خلاف مزاحمت

iii مذہبی توہم پرستی کے خلاف مزاحمت

iv تہذیبی وثقافتی غلبہ کے خلاف مزاحمت

v ناپسندیدہ عناصر کے خلاف مزاحمت

vi معاشی واقتصادی غلبہ کے خلاف مزاحمت

vii لسانی تعصب کے خلاف مزاحمت

viii ذہنی ونفسیاتی دباؤ کے خلاف مزاحمت

ix ادبی جبر کے خلاف مزاحمت

i ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت

ریاست قوم کی ماں کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اپنی قوم کے افراد کی تمام سماجی، مذہبی، تہذیبی اور معاشی و معاشرتی معاملات کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ یوں ریاست کی حقیقی ذمہ داری ریاست کے عوام کے حقوق کی حفاظت اور ہمہ قسمی تحفظ شامل ہوتا ہے۔ جب ریاست غیر جمہوری رویوں کے حامل ارباب اقتدار کے ہاتھ یرغمال بن جاتی ہے تو یہ عناصر اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے حصول کے لیے عوام کے حقوق کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے ظلم و زیادتی کے علاوہ ایسے قوانین مرتب کرتے ہے جو عوام کو سہولت کی بجائے جبر کی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں۔ ان کے بنیادی معاشرتی حقوق کو پامال کر دیا جاتا ہے۔ ریاست اپنے عوام کے جان و مال کی محافظ ہوتی ہے مگر عوام پر ظالمانہ قوانین نافذ کر کے ریاستی جبر کا شکار بنا دیتی ہے۔ جس سے عوام میں بے چینی اور انتشار پھیل جاتا ہے جو رفتہ رفتہ انارکی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اقوام زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور ریاستیں ان جابر حکمرانوں کے جابرانہ ہتھکنڈوں سے متاثر ہو کر اپنا وجود ضائع کر بیٹھتی ہیں۔ ریاستی جبر کے بارے میں Christian Davenport لکھتے ہیں:

> "State repesssion includes harassment, surveillance/spying, bans, arrest, torture and mass killing by government agents and /or affilicetes within their territorial jurisdiction"(43)

ii سماج میں تخریبی عناصر کے خلاف مزاحمت

سماج کی بنیادی اکائی فرد ہے اور افراد کا مجموعہ سماج تشکیل دیتا ہے۔ یعنی سماج میں جتنے افراد ہوں گے اتنے ہی رویے ظہور میں آئیں گے کیونکہ ہر فرد اپنے فکر و عمل، شعار زندگی کے حوالے سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔ عہد قدیم کا انسان ایسے چھوٹے چھوٹے سماج تشکیل دے کر رہتا تھا جن کا مقصد مختلف ناپسندیدہ عناصر کے خلاف اپنی نسل کا تحفظ ہوتا تھا جیسے قدرتی آفات، جنگلی درندے یا پھر سماج کے غارت گر لوگ ان کی مزاحمت ماحول کے انہی ناپسندیدہ عناصر کے خلاف ہوتی تھی۔ انسان نے جب شائستگی اور تہذیب کا دامن تھاما تو بڑے بڑے سماج تشکیل دے، ان سماج کے حوالے سے مختلف اصول و قوانین بھی مرتب کیے۔ مگر یہ سماجی اصول اور ضابطے ہر سماج میں ایک طرح کے نہیں تھے کیونکہ سماج کا طاقت ور طبقہ انہی اصول و ضوابط کا تعین کنندہ ہوتا تھا۔ یہ طبقہ سماجی اصولوں کے طے کرتے وقت اپنے مفادات کو فوقیت دیتا اور سماج کے کمزور افراد پر استحصالی و استعماری حربے استعمال کرتا تھا۔ برصغیر میں پہلا سماجی جبر آریا سماج کے دور میں ہوا۔ انہوں نے برصغیر میں مقامی لوگوں کے حقوق غصب کیے، بنیادی لوازمات زندگی پر غاصبانہ قبضہ کیا اور یہاں کے حقیقی باشندوں کو اپنا خدمت گار / غلام بنا ڈالا۔ آریا سماج نے امتیازات قائم کرتے ہوئے افراد کی متعدد اصناف بنا ڈالیں۔ سب سے برتر وہ اعلیٰ برہمن کہلائے۔ جو مذہبی معاملات اور تعلیم و تعلم کے شعبہ سے وابسطہ ہوئے۔

دوسرا معزز ترین طبقہ کھشتری کہلایا۔ جس کا فریضہ ملکی دفاع اور حکومتی امور سرانجام دینا ہوتا تھا۔ تیسرے درجے کے لوگ ویش کہلائے جو کاشتکاری اور تجارتی معاملات سنبھالا کرتے تھے سب سے کم تر درجہ پر شودر براجمان تھے۔ یہ مقامی آبادی تھی جنہیں آریہ سماج نے غلبہ پا کر ان کا سماجی استحصال کیا۔ ان کا کام صرف اور صرف بڑی ذات کے لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ یہ سماجی جبر کی بھیانک مثال تھی۔ کیونکہ آریا سماج نے جو سماجی اصول قائم کیے تھے۔ ان کی روسے شودر کو ملیچھ / نجس سمجھا جاتا تھا۔ یہ اونچی ذات والے لوگوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتے تھے۔ اگر غلطی سے کسی شودر کا کوئی عضو کسی اعلیٰ ذات کے فرد کے بدن سے چھو جاتا تو یہ ان کی توہین ہوتی، اس شودر کے لیے سزائے موت۔ رفتہ رفتہ اس ظالمانہ سماجی طرز عمل سے متاثر ہو کر مقامی آبادی آریا سماج کے رنگ ڈھنگ میں ڈھل گئی۔ سماج میں تخریبی رویے ہمیشہ سماج کے لیے تباہی کا باعث رہے ہیں۔

iii مذہبی توہم پرستی کے خلاف مزاحمت

دنیا کی وحشی سے وحشی اور مہذب ترین کوئی بھی قوم کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ ہوتی ہے۔ انہی مذہبی نظریات پر ان کی مذہبی فکر و اقدار، عبادات اور زندگی کے معاملات دار و مدار رکھتے ہیں۔ کسی قوم کے مذہبی زندگی کے تمام زاویے ان کے مذہبی نظریات کی عملی صورت ہوتے ہیں۔ آدمؑ سے لے کر تا حال الہامی اور غیر الہامی مذاہب اس روئے زمین پر لوگوں میں مقبول رہے ہیں۔ معاشرے کے بہت سے افراد ان مذہبی تعلیمات سے شدت سے جڑ گئے، یوں مذہبی لوگ کہلائے۔ ایسے مذہبی لوگ جو باقاعدہ اپنے مذہب کی درست تعلیمات سے شناساں تھے انہوں نے اپنے مذہب کی درست تصویر دنیا کے سامنے پیش کی اور ایک معقول مذہبی طرز وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض مذاہب میں کچھ ایسے لوگوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ لیا جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے کی حقیقت رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے مذہب اپنے ذاتی مفاد، ذاتی افکار و نظریات اور اپنا دائرہ عقیدت وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ ان میں کچھ لوگ مذہبی تعلیمات سے بے بہرہ اور جاہلیت کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں ایجاد کیں۔ یہ رسمیں ایسی تھیں کہ جن کی حقیقت اور عملی صورت پر ایک باشعور انسان شدید تکلیف محسوس کرتا ہے جب کہ ان اقدار و رسومات کا مذہبی تعلیمات سے دور دور کا بھی تعلق نہیں۔ صرف ان جہلا کے دلوں کی اختراعات ہیں۔ دوسری جانب مذہب کی طرف مائل سماج کے افراد ایسے لوگوں کا آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے اس توہم پرستی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ شخصیت پرستی اور اور اندھی تقلید کی صورت میں معرض وجود میں آتا ہے۔ یہ عیار مذہب کا لبادہ اوڑھ کر معاشرے میں کمزور عقیدہ کے حامل افراد کو اپنی دنیاوی حرص اور طمع کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ توہم پرست افراد ان عیار مذہبی لوگوں کے بارے میں سماج میں طرح طرح کی نرالی باتیں اور من گھڑت واقعات پیش کر کے دیگر افراد کو بھی اس طرح مائل کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ یوں مذہبی توہم پرستی معاشرے میں جنم لیتی

ہے۔ دنیا کے تمام الہامی مذاہب میں فرقہ واریت موجود ہے اور یہ فرقہ واریت اس مذہبی توہم پرستی کا خوف ناک نتیجہ ہے۔ جو کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کو ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں متحد نہیں ہونے دیتا۔

iv تہذیبی و ثقافتی غلبہ کے خلاف مزاحمت

دنیا کے قرطاس پر تاریخ انسانی کے ہر عہد میں مختلف قومیں اور تہذیبیں جنم لیتی رہیں، ایک مخصوص مدت کے بعد صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ تمام قومیں اور تہذیبیں کسی نہ کسی ثقافتی رویے کی حامل تھیں۔ بعض اقوام کے آثار سے ان کی تہذیب و ثقافت پر دوسرے خطے کی تہذیب و ثقافت کے اثرات تھے۔ عہد قدیم سے عہد جدید تک مختلف قومیں، مختلف ادوار میں دیگر قوموں کی تہذیب و ثقافت کے سانچے ڈھلتی رہیں۔ کئی قومیں ایسی بھی تھیں جنہوں نے بیرونی تہذیبی اور ثقافتی یلغار کو قبول نہ کیا بلکہ ان کے خلاف مزاحمت کرتی رہیں۔ کسی بھی خطے کی قوم اپنی جداگانہ تہذیب و ثقافت اور جداگانہ تشخص رکھتی ہے، جسے وہ ہر حال میں اپنی پہچان سمجھتی ہے۔ اس طرح کی قومیں ہمیشہ اپنی تہذیب و ثقافت کو ترجیح دیتی ہیں اور بیرونی تہذیب و ثقافت کو قبول نہیں کرتیں۔ یہی رویہ تہذیبی و ثقافتی رویوں کے خلاف مزاحمت کا نام ہے۔ برصغیر میں آریا سماج سے پہلے یہاں دراوڑی تہذیب کے حامل لوگ رہا کرتے تھے۔ مگر آریا سماج کے لوگوں نے غلبہ پاتے ہی نہ صرف یہاں کے لوگوں پر اپنا تسلط قائم کیا بلکہ یہاں کے مقامی لوگوں کی تہذیب و ثقافت پر بھی اثر انداز ہوئے۔ جب مسلمان فاتحین نے برصغیر کے طول وارض پر اپنی حکمرانی قائم کی تو اپنے ساتھ اپنا ثقافتی رنگ بھی لائے۔ کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا اور کچھ نے اس کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ اپنی تہذیب کے ساتھ شدت کے ساتھ منسلک رہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے تشخص پر تسلط پانے کی کوشش کرنے والی ہر تہذیب کے خلاف اپنا ردعمل پیش کرتی ہے۔

v ناپسندیدہ سیاسی عناصر کے خلاف مزاحمت

دنیا میں سیاسی مزاحمت کے دائرہ کار مختلف شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ علاقائی، صوبائی اور عالمی سطح کے ناپسندیدہ عناصر کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے۔ علاقائی مزاحمت اکثر و بیشتر اپنے علاقے کی سیاسی قیادت کے خلاف ہوتی ہے۔ جو وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر عوام سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں مگر عوام سے کیے گئے وعدوں کی تکمیل نہیں کرتے۔ علاقے میں اپنا سیاسی تسلط قائم رکھنے کیلئے سیاسی مخالفین کو اپنے اثر ورسوخ کی بناپر ناجائز مقدمات میں الجھائے رکھتے ہے۔ ایسے سیاستدانوں کے خلاف علاقے میں مزاحمتی جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ بعض ممالک میں صوبائیت کی بناپر صوبائی سیاست میں بھی ایک دوسرے کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے۔ جب کسی کمزور یا چھوٹے صوبے کی عوام کے حقوق کوئی طاقت ور/ بڑا صوبہ ہڑپنا چاہتا ہے تو اس صوبے کی سیاسی قیادت بڑے صوبے

کے خلاف سیاسی مزاحمت کرتی ہے۔کچھ سیاسی لوگ اقتدار کی طاقت حاصل کر کے اپنے سیاسی منصب کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک و قوم کو کرپشن و بدعنوانی کے ذریعے لوٹنے کھسوٹنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی عوامی خدمت کے برعکس عوامی خدمت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ان کا مرکز و محور صرف اقتدار ہوتا ہے نہ کہ سیاسی نظریہ۔سیاستدانوں کے اس غیر جمہوری رویے کے خلاف عوام مزاحمت اور احتجاج کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اکثر سیاستدان، سیاست میں صرف اس لیے دلچسپی رکھتے ہیں کہ اقتدار کے مزے لوٹیں، شاہانہ طرز زندگی گزاریں اور دولت و شہرت سمیٹ سکیں۔ موجودہ دور میں سیاستدانوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جس کو ملکی اور عوامی مسائل کے حل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اس طرح سیاستدانوں کے بارے ڈاکٹر ظفر حسین رقمطراز ہیں:

> ’’سیاستدانوں کی عوامی مسائل سے دلچسپی، رشوت ستانی، عیش پرستی، ضمیر فروشی، اخلاقی پستی، سیاسی جماعتوں کی فرقہ پرستی، نسل پرستی اور ذات پات کی پالیسی، سیاست کا مجرمانہ ، مجرموں کا سیاسیانہ، یہ وہ چند حقیقتیں ہیں جو اس عہد کی سیاست کا خاصہ بن چکی ہیں۔‘‘(۴۴)

سیاسی مزاحمت کا سب سے بڑا دائرہ کار عالمی مزاحمت کا ہے۔ دنیا کے بڑے اور طاقت ور ممالک اپنی چودھراہٹ اور ہوس ملک گیری کے سافلانہ جذبات کے تحت کمزور ممالک پر چڑھ دوڑتے ہیں۔اپنی فوجی طاقت یا پھر سرد جنگ کے ذریعے عالمی سطح پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے جرمنی اور برطانیہ کے درمیان دو عالمی جنگیں، امریکہ اور سوویت یونین کا باہمی ٹکراؤ، امریکہ کی مشرق وسطہ میں یلغار اور یہاں کے ممالک کا امریکہ کے خلاف جدوجہد کرنا عالمی سیاسی مزاحمت کی مثال ہے۔

vi معاشی واقتصادی غلبہ کے خلاف مزاحمت

کسی بھی معاشرے میں رہنے والے افراد کی سب سے بڑی ضرورت معیشت ہے۔اسی معیشت کے بل بوتے پر وہ معاشرہ اپنی ضروریات زندگی پورا کر کے اپنی بقاء کیلئے تگ و دو کرتا ہے۔ بعض اوقات معاشرتی عناصر ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو مفاد پرستی اور خود غرضی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ اپنی فطرتی ہوس کی بنا پر لوگوں کا معاشی واقتصادی استحصال کرتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے۔وہ اپنی اسی عادت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ مال و دولت اکٹھا کرنے کی ہوس میں گھر جاتا ہے۔اپنی دولت میں اضافہ کرنے کیلئے کئی طرح کے معاشی واقتصادی جبر اور غیر منصفانہ حربے استعمال کرتا ہے۔ جس میں غریب مزدوروں کا استحصال، مزدوری کے اوقات زیادہ طے کرنا، کام زیادہ لینا اور اجرت کم دینا یا اس میں سے بھی بعض اوقات طے شدہ مزدوری نہ دینا۔اس طرح مزدور طبقہ میں مزاحمتی

جذبات جنم لیتے ہیں۔ اقتصادی اور معاشی استحصال کے خلاف دوسری صورت سود خوری ہے۔ جس میں سود خور محض اپنے سرمائے کے بل بوتے پر لاچار و نادار لوگوں کی محنت کی کمائی با جبر و اکراہ ہڑپ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غریب سخت محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتا ہے وہ سود خور سود کی مد میں اس کی کمائی چھین لیتا ہے۔ وہ مفلوک الحال شخص ساری زندگی معاشی جبر اور استحصال کا شکار رہتا ہے۔ یہ غریب نادار طبقہ ان سود خوروں کے خلاف مزاحمت کرتا نظر آتا ہے۔ معاشی و اقتصادی جبر کی ایک تیسری صورت زرعی اجناس پر لوگوں کا استحصالی رویہ کئی دولت مند لوگ اپنا دام حرص پھیلائے مختلف زرعی اجناس کو خرید کر کے ذخیرہ اندوزی کر لیتے ہیں۔ پھر شدید ضرورتوں کے وقت انتہائی مہنگے، داموں وہ اشیائے ضروریہ یا زرعی اجناس کسان سے سستے داموں خرید کر کے مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ یوں عوام الناس کا معاشی و اقتصادی استحصال کرتے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی جبر کی سب سے خطرناک صورتحال اس وقت سامنے آتی ہے جب عوام، حکومت اور حکومتی اہلکاروں کے معاشی و اقتصادی جبر کے سامنے بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف حکومت ناجائز محصولات عوام پر لاگو کر کے انہیں معاشی دباؤ میں لاتی ہے دوسری طرف سرکاری اہلکار عوام کے جمع شدہ محصولات سے خدمتانہ وصول کر کے بھی عوام الناس کے مسائل حل کرنے کے لیے ناجائز طور رشوت طلب کر کے ان کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب اس طرح کے معاشی و اقتصادی جبر کے رویے برداشت کی حد سے باہر ہو جائیں تو ان خوف ناک رویوں کے خلاف باغیانہ خیالات جنم لینے لگتے ہیں۔ انقلاب روس اور انقلاب فرانس معاشی و اقتصادی جبر کی نمایاں مثالیں ہیں اور یہی دنیا کی کئی استعماری اور استحصالی سوچ رکھنے والے ممالک کا ہتھیار ہے۔ انہوں نے اپنے مخالف ممالک کو مختلف قسم کی اقتصادی و معاشی پابندیوں کے حصار میں لے کر سب سے پہلے ان کی معیشت پر کاری ضرب لگائی پھر انہیں معاشی طور پر اس قدر کمزور کر ڈالا کہ وہ مخالف ریاستیں ان طاقتور ممالک کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئیں۔

vii لسانی تعصب کے خلاف مزاحمت

کسی بھی تہذیب کے باسی افہام و تفہیم، معاملات کے تعین اور باہمی ربط ضبط کے لیے کسی نہ کسی زبان کو وسیلہ اظہار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دنیا میں بھانت بھانت کر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بعض جغرافیائی خطوں میں کچھ زبانوں کو غالب اکثریت زبان بولنے والوں کی طرف سے جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ لسانی جبر جب حد سے بڑھنے لگے تو اس کے سامنے مزاحمتی دیواریں کھڑی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف زبان بولنے والوں کو لسانی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

- جب عرب قوم نے عجمی اقوام کو اپنے زیر تسلط لیا تو اس دور میں عربوں کی جانب سے فارسی زبان کو لسانی جبر برداشت کرنا پڑا۔
- یورپ میں جب فرانس نے برطانیہ پر قبضہ جمایا تو انگریزی کو ترک کرکے فرانسیسی زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔
- وسط ایشیا کے مسلمان حکمران ہندوستان پر قابض ہوئے تو انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کو اپنی قومی زبان کے ذریعے لسانی جبر کا نشانہ بنایا جس سے فارسی سے ہندی، ہندی سے اردو پروان چڑھتی گئیں۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے مگر اسے بھی مختلف علاقائی زبانیں بولنے والوں کی جانب سے لسانی جبر کا سامنا ہے۔ جب قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن میں اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی تو بنگالی قوم غم و غصے سے تلملانے لگی۔ اسی لسانی عصبیت کو بنیاد بناکر اردو کے خلاف مزاحمتی تحریک چلائی۔ جس کا آغاز وہاں کے طلبا نے کیا اور عوام اس تحریک میں شامل ہوتی چلی گئی۔ صرف تین سال بعد اس لسانی جبر کے سامنے اردو کو پسپا ہونا پڑا اور مشرقی پاکستان کی قومی زبان بنگلہ قرار پائی۔ لسانی جبر اکثر و بیشتر جغرافیائی اور نسلی تعصب کی بنا پر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اردو کو انگریزی زبان سے کافی مزاحمت کا سامنا ہے۔ پاکستان کے حکمران اردو کو وہ مقام/درجہ نہیں دیتے جو بحیثیت قومی زبان اسے ملنا چاہیے۔ یہ اپنی قومی زبان کے خلاف لسانی جبر کی بدترین صورت حال ہے۔ اردو زبان و ادب سے لگاؤ اور شغف رکھنے والی بعض شخصیات کی جانب سے اردو زبان کے فروغ اور نفاذ کے لیے بیسیوں کوششیں جاری ہیں۔ یہی کوششیں اردو زبان کے حوالے لسانی جبر کے خلاف مزاحمت کی واضح مثالیں ہیں۔

viii ذہنی و نفسیاتی دباؤ کے خلاف مزاحمت

کسی بھی معاشرے میں سکونت پذیر افراد کو جب ان کے جائز حقوق غیر مشروط طور پر فراہم ہوتے رہیں تو وہ معاشرہ امن و آشتی، راحت و سکون کا مرقع بن جاتا ہے۔ لیکن جب افراد معاشرہ کے ذہنی و نفسیاتی دباؤ کا استحصال کیا جائے تو وہ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں انتشار، بے چینی اور دیگر معاشرتی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ سب سے زیادہ ذہنی و نفسیاتی دباؤ مطلق العنان بادشاہوں اور جابرانہ مزاج کے حامل حکمرانوں کی طرف سے ملک کے باشعور افراد پر ڈالا گیا۔ کیوں کہ یہ باشعور افراد جن کا تعلق صحافت، ادب اور دیگر سماجی شعور کے اداروں سے تھا۔ وہ اس ہمہ قسمی استحصال کے خلاف بر سرپیکار ہوں ڈٹ گئے۔ ظالم و جابر حکمرانوں نے انہیں اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر ان پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑ دیے۔ بلاوجہ گرفتاریاں، قید و بند کی صعوبتیں اور احتجاج کرنے والوں کو مسلح یلغار بناکر ان کے قلوب و اذہان میں دہشت قائم کرکے اپنے دباؤ میں لے لیا تاکہ احتجاج کرنے والا یہ سماجی شعور کا

حامل طبقہ کل کو ان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کر سکے نہ ہی سر اٹھانے کی جسارت کر سکے۔ قیام پاکستان کے بعد کئی مراحل پر مختلف طالع آزماؤں نے اقتدار کی دیوی کو چھین جھپٹ کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ جب ملکی عوام نے ان اقدامات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو ان حکمرانوں نے ان کو کوڑے مروائے، قتل کروادیا اور بعض کو مدتوں پسِ زنداں رکھا۔ ان تمام اقدامات کا اصل مقصد لوگوں کے اوپر اپنی ہیبت طاری کرنا تھا۔ کیوں کہ جب خوف اور دہشت کے سائے دل ودماغ میں گھر کر جائیں تو پھر رسی بھی انسان کو سانپ نظر آتی ہے۔

xi ادبی جبر کے خلاف مزاحمت

ادب بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر جب کسی ناگوار رویے کا سامنا کرتا ہے یا سماجی ناہمواریوں کو محسوس کرتا ہے تو اس کی باطنی حساسیت کی بنا پر ایک باغیانہ جذبہ جنم لیتا ہے، جسے وہ الفاظ کا قالب دے کر مزاحمتی ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایسا ادب دنیا کی کم و بیش ہر زبان میں موجود ہے لیکن ہر زبان کی مختلف ادوار میں ادبی ترجیحات مختلف رہی ہیں۔ جب مختلف زبانوں پر دنیا کی کئی زبانوں نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا مگر کچھ زبانوں نے اپنے ادبی ترجیحات کی بنا پر انہیں مسترد کر دیا۔ برصغیر کی تاریخ میں ابتداً مقامی زبانوں کے علاوہ یہاں پر مسلط قوموں کی زبان میں ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔ مسلمانوں کی آمد اور ترک حکمرانوں کی وجہ سے برصغیر میں فارسی شعر وادب کا دور دورا ہوا۔ ان مسلمان حکمرانوں کے ساتھ مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے لشکری شعراء و ادباء ہندوستان آئے۔ جب ان زبانوں کا برصغیر کی مقامی زبانوں سے اختلاط ہوا تو اس سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جو ہندی، ہندوی، ریختہ، اردوئے معلیٰ اور اردو کے نام سے جانی گئی۔ فارسی سے چھٹکارا پانے کے لیے کچھ شعرا نے ایہام گوئی کا سہارا لیا اور فارسی کے ادبی جبر کے خلاف مزاحمت کی۔ ایہام گوئی کی تاریخ ادبی جبر کے خلاف مزاحمت کی کامل مثال ہے۔ اردو زبان کے ابتدائی اور ارتقائی دور میں اردو شاعری کو تکلفات، حجابات میں ملفوف کر دیا گیا تھا۔ صرف قدرت کلام اور الفاظ کی نگینہ کاری کرنے والے لوگ ہی اردو نظم وغزل میں طبع آزمائی کر سکتے تھے۔ خصوصاً اردو کی نظم نگاری میں ان تکلفات اور حجابات کی پردہ دری کرنے والے پہلے بے تکلف اور عوامی شاعر نذیر اکبر آبادی تھے۔ جنھوں نے نہ صرف اردو کے نظمیہ ادب کو خواص کے چنگل سے نکالا بلکہ اسے عوامی چیز بنا دیا۔ اس کے بعد اسی کی تحریک کا تسلسل محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی کی نظم گوئی اور جدید اردو تنقید کی شکل میں ادبی جبر کے خلاف مزاحمت کا نقطہ عروج ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی رقمطراز ہیں:

> ”مزاحمتی ادب سے تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر اور دانشور اپنی حکومتوں اور حکمران طبقوں کے جرائم کو دیکھ کر خاموش نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

اور انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کرب اور اذیت کا احساس دلاتے ہیں کہ جس سے لوگ دوچار ہوتے ہیں اور یہی احساس ان جرائم کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرتا ہے اور ان کے خلاف تحریک چلتی ہے۔"(۴۵)

ہر دور میں ادباء اور شعراء نے اس وقت حکومتی ناقص پالیسیوں اور ہر طرح کے جبر کے خلاف اپنے قلم کی طاقت سے مزاحمت کی۔ ادبی جبر کے خلاف مزاحمت کی وجہ سے اردو ادب میں مختلف دبستان وجود میں آئے۔ جن میں دو دبستان قیام پاکستان سے پہلے اور دو بعد میں وجود میں آئے۔ قیام پاکستان کے پہلے کے دبستانوں میں دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی ادبی مزاحمت اور معاصرانہ چشمک کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے دو ادبی دابستان، دبستان لاہور اور دبستان کراچی وجود میں آئے۔ انہوں نے بھی ایک دوسرے کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جسے ہم ادبی جبر کے خلاف مزاحمت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ زمان، وحید۔القاموس الوحید،لاہور: ادارہ اسلامیان، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۵۔

۲۔ معلوف، لوئیس۔المنجد، کراچی: قاسم پبلی کیشنز، ص ۲۴، س ن۔

۳۔ فیروزالدین، فیروز اللغات اردو، لاہور: فیروز سنز، ص ۷۷، س ن۔

۴۔ عبدالحکیم، ابو نعیم۔قائد اللغات اردو، لاہور: حامد اینڈ کمپنی، ص ۶۱، س ن۔

۵۔ حسین، احتشام۔تنقید اور عملی تنقید، لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۔

۶۔ سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو ادب، ۲۰۱۵ء، ص۔ ۴

۷۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۸۔ سہیل، محمد۔تاریخ ادب اردو، لاہور: بھٹی سنز پبلشرز، ص ۹۹۴، س ن۔

۹۔ ایضاً، ص ۹۹۴۔

10. Webster's new illustrated dictionary, allans frederick kullen reinst, books, INC publishers New York, Washington, DC, 1970, p 670

۱۱۔ کوثر مظہری۔جرات اظہار (تنقیدی مضامین)، نئی دہلی: شارپ پرنٹنگ ایجنسی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۔

۱۲۔ ناصر بغدادی۔بادبان، کراچی: ذکی پرنٹرز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۵۔

۱۳۔ جمیل، خاور۔ادب، کلچر اور مسائل، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۔

۱۴۔ رفیق، سعید احمد۔فن اور مطالعہ فن، کراچی: قمر کتاب گھر، ۱۹۸۸ء، س ۱۵۷۔

۱۵۔ حسرت کاسگنجوی۔ادب: علمی و فکری زاویے، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹۔

۱۶۔ حسین، اختر۔ ادب اور انقلاب، حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ء۔

۱۷۔ امجد، رشید۔ پاکستانی ادب تنقید، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۲ء، ص ۳۸۷۔

۱۸۔ سرور، آل احمد۔ اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)، الہ آباد: سرسوتی پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۴۷۔

۱۹۔ خان، عبداللہ۔ فرہنگ عامرہ، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۱ء، ص ۵۷۲۔

۲۰۔ احمد دہلوی۔ فرہنگ آصفیہ، دہلی: نیشنل اکادمی، ۱۹۷۴ء، ص ۳۳۹۔

۲۱۔ احمد، کلیم الدین۔ انگریزی اردو لغت، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۸ء، س ۱۶۸۔

22. The standard English Urdu Dictionary Dr. Abdul Haq, Anjuman Taraqqi Urdu a (Hind) New Dehli-2005-P.N 1009

23. Collins Cobuild English Dictionary Harper collins India Pvt. Ltd (india), New Dehli, 1991, p;1233

۲۴۔ فیروزالدین۔ فیروز اللغات اردو، لاہور: فیروز سنز، س ن۔

۲۵۔ نیر، نورالحسن۔ نور اللغات، لکھنؤ: نیر پریس، س ن۔

۲۶۔ احمد، انوار۔ درسی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

۲۷۔ حق، شان۔ فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

28. Concise oxford American Dictionary

29. collins cobuild English Dictionary, Harper collins india pvt. Ltd, New Dehli, 1991.

۳۰۔ احمد، کلیم الدین۔ انگریزی اردو لغت، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء۔

۳۱۔ صغیر، احمد۔ جدید اردو افسانوں میں احتجاج کی بازگشت، نئی دہلی: مکتبہ استعارہ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۱۔

۳۲۔ کریم،ارتضیٰ۔اردو ادب:احتجاج اور مزاحمت کے رویے،دہلی:اردو اکادمی،۲۰۰۴ء،ص ۲۔

33. http//:www.deedbanmagazine.com/blong.aalmy-mzhmt-k-shryt,23/03/2018, 08:15 pm

۳۴۔ جاوید، علی۔افہام و تفہیم، نئی دہلی: رائٹرس گلڈ انڈیا لمیٹڈ،۲۰۰۴ء، ص ۴۷۔

۳۵۔ احمد، ابرار۔ ''مزاحمتی ادب''، مشمولہ: رشید امجد۔ مزاحمتی ادب اردو ،اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸۔

۳۶۔ احمد،انوار۔''عالمی مزاحمتی شاعری''،مرتبہ کشور ناہید،ماہ نو جلد اکتالیس،لاہور:لاہور:۱۹۸۹ء،ص ۲۳۔

۳۷۔ امجد،رشید۔''اردو ادب میں مزاحمتی ادب کی روایت''،مشمولہ مزاحمتی ادب اردو،اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۱۹۹۵ء،ص ۲۵۔

۳۸۔ اختر، سلیم۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،لاہور:سنگ میل،پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء،ص ۶۲۰۔

۳۹۔ امجد،رشید۔''اردو ادب میں مزاحمتی ادب کی روایت''،مشمولہ مزاحمتی ادب اردو،اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۱۹۹۵ء،ص ۴۹۔

۴۰۔ احمد، فیض۔نسخہ ہائے وفا،دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس،۱۹۹۲ء،ص ۸۱۔

۴۱۔ جالب، حبیب۔کلیات حبیب جالب،لاہور:طاہر سنز پبلشرز،۲۰۱۴ء،ص ۳۸۔

۴۲۔ سہگل،روبینہ۔عورت اور مزاحمت،لاہور: مشعل پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء،ص ۲۳۔

43. Christian Davenport, state Repression and political order university of Maryland press, 20742

۴۴۔ حسین، آغا۔مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء،ص ۳۰۔

۴۵۔ علی،مبارک۔''مزاحمتی ادب''،مرتبہ کشور ناہید۔ماہ نو جلد اکتالیس،۱۹۸۹ء،ص ۵۔

باب دوم

جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگار اور سیاسی مزاحمتی عناصر

الف: بنیادی انسانی حقوق !مزاحمتی رویوں کا جائزہ

ب: آزادی اظہار رائے !مزاحمتی عناصر کا مطالعہ

ج: بنیادی جمہوری حقوق !مزاحمت کا تجزیاتی مطالعہ

د: مارشل لاء کے خلاف مزاحمت !افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگار اور سیاسی مزاحمتی عناصر

اردو میں لفظ سیاست عربی زبان سے لیا گیا ہے جس کے معنی تدبیر وانتظام کے ہیں۔ معاشرے کی دیکھ بھال، منظم اور پر امن رکھنا یعنی انسانی سماج کا منظم یا کسی ریاست کے امور کا مطالعہ جس کے توسط سے کیا جاتا ہے اسے علم سیاست کہا جاتا ہے۔

درج ذیل سیاست کی تعاریف ملاحظہ کریں

فرہنگ تلفظ کے مطابق:

"سیاست عربی زبان کا لفظ ہے سیاست کے معنی حکمت عملی، مصلحت اندیشی، حکمرانی، ملکی امور، حصول اقتدار اور مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔" 1

جامع علمی اردو لغت کے مطابق :

"سیاست کے معنی حفاظت، نگہبانی، انتظام، دہشت، گناہوں کی سزا، ملکی معاملات، بازپرس ہیں۔" 2

فرہنگ آصفیہ کے مطابق :

"لفظ سیاست کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت اور سلطنت، ملک کا انتظام، بندوبست اور نظم و نسق ہیں۔" 3

قومی انگریزی اردو لغت میں:

"سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملی اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، ان لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے خواہاں ہوں۔" 4

ایڈورڈ جنکسن کے مطابق:

"سیاست کاروبارِ حکومت ہے یعنی ان لوگوں کو قابو میں رکھنا اور ان کا انتظام کرنا جو باہم مل کر معاشرے میں رہتے ہیں۔" 5

Political Science :

" The Branch of knowledge that deals with the state and system of government : the scientific analysis of political activity and behaviour." 6

اردو کا لفظ سیاست انگریزی کے لفظ politics کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کا مادہ اشتقاق 'ساس' ہے جس کا تعلق یونانی زبان سے ہے۔ اہل یونان نے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر اپنی ریاستیں یا حکومتیں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ ان ریاستوں کو 'Polis' کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ریاستی انتظام و امور کے لیے کی جانے والی عملی جدوجہد کے لیے لفظ Politics استعمال کیا جانے لگا۔ اس کی بنیاد لفظ "Polis" ہے، جس سے مراد شہر، شہر میں رہنے والے اور شہری ریاست کے ہیں۔

" The word 'politics' is derived from polis, meaning Literally, city state , ancient Greek society was devided into a collection of independient city-state, each of which possessed its own system of Government. " 7

اسلام میں سیاست ایسے فعل کو کہا گیا ہے جس سے معاشرے کے افراد کو اصلاح سے قریب، فساد سے دور کیا جائے اور عدل و انصاف قائم کیا جائے۔ حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے:

"جس طرح پہلے کے انبیاء کرامؑ اپنے اپنے دور حیات میں سیاست کیا کرتے تھے، ان کے بعد سیاسی امور ان کے بعد والے انبیاء کرام نبھاتے تھے۔ اس دور کے سیاسی معاملات میں انجام دے رہا ہوں، چونکہ میرے بعد کسی نبی نے تشریف نہیں لانا اس لیے میرے بعد سیاسی امور میرے خلفاء سر انجام دیں گے اور ان کی تعداد بکثرت ہو گی۔" 8

سیاست نیک اور باصلاحیت لوگوں کا شیوہ تھی اور ہے۔ موجودہ سیاسی نظام اور انبیاء و خلفاء کے سیاسی نظام میں بہت فرق ہے۔ اس وقت سیاست اس وقت کے بہترین لوگ کیا کرتے تھے۔ موجودہ سیاسی نظام میں اکثر ایسے افراد داخل ہو چکے ہیں جو سیاست کو فقط جاہ و مرتبہ حاصل کرنا، اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر اپنے ملکی عوام پر قہر ڈھانا، مختلف پہلوئوں سے عوام کا استحصال کرنے کی سوچ کے مالک ہیں۔ چونکہ ایسے سیاستدان اسلامی نظام سیاست اور اس کی تعلیمات سے نابلد ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی سونپی ہوئی امانت کی بجائے اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔ خوف خدا سے عاری یہ طبقہ جبر و استحصال کے علاوہ کسی بات سے واقف نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ معاشرے میں عمومی طور پر ایک غلط فکر پائی جاتی ہے۔ وہ فکر یہ ہے کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا کہنے والے لوگ وہ لوگ ہیں جو اسلامی نظام حیات سے بیزار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے تو اس میں حکومت و

سلطنت کے امور انجام دینے کے لیے بھی تعلیمات موجود ہیں۔ اسلام صرف عقائد، نظریات اور عبادات کا نام نہیں بلکہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، تجارتی اور خاندانی ہر زاویے سے شعور باہم پہنچاتا ہے۔

اسلام میں حکمران وقت کے حوالے سے رسول اللہ نے جو تعلیم دی ہے موجودہ زمانے میں اکثر سیاستدان اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ان لوگوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ اپنے مفادات سوچے۔ عوامی مفادات کے بارے انہیں کچھ پرواہ نہیں۔ ان کی سیاست ذاتی اغراض و مقاصد کے گرد گھومتی ہے۔ پاکستان اپنے جغرافیائی وجود اور تاریخی پس منظر کے لحاظ سے دنیا کا اہم ترین خطہ ہے۔ اس کے چار صوبے ہیں۔ ہر صوبہ اپنی تہذیب و ثقافت اور مقامی حالات میں منفرد ہے۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب ہے، جو مختلف انتظامی ڈویژنز جو سرائیکی زبان بولنے والوں کا قلب کہلاتے ہیں۔ جن میں ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان شامل ہیں۔ یہ خطہ جنوبی پنجاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس خطے کی قدرتی آب و ہوا اور یہاں بولی جانے والی تاریخی و شیریں لب و لہجہ رکھنے والی سرائیکی زبان اسے ملکی سطح پر منفرد بناتی ہے۔

> ”بہاول پور، ملتان اور ڈیرہ غازی خان کا یہ خطہ جنوبی پنجاب کہلاتا ہے تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ خطہ ہر دور میں اپنی سربلندی و شادابی کی وجہ سے حملہ آوروں کے لیے پرکشش بنا رہا۔ علاوہ بریں تقریباً ہر سیاح اور جغرافیہ نویس نے چاہے وہ عرب و ہند سے تعلق رکھتا ہو یا یورپ کی سرزمین سے اپنی تصنیف میں اس علاقے کا ذکر کیا ہے۔“
>
> 9

یہ خطہ قدیم تہذیب و ثقافت اور ادب کا آئینہ دار ہے۔ سرائیکی ادب تو اس خطے کی قدیم پہچان ہے مگر اردو افسانوی ادب کے حوالے سے بھی کافی زرخیز ہے۔ اس خطے میں جنم لینے والے اردو افسانوی ادب کے تخلیق کاروں نے مزاحمتی ادب میں جنوبی پنجاب کو عالمی سطح پر روشناس کرایا۔ جنوبی پنجاب کے اردو افسانوی ادب میں مزاحمت کار اونچے قد کاٹھ کے حامل ہیں، جنہوں نے اپنی ادبی کاوشوں کے ذریعے اردو افسانوی ادب میں مزاحمت کو سمو کر رکھ دیا۔ جنوبی پنجاب میں ہونے والے ہر طرح کے ناپسندیدہ عناصر کے خلاف مزاحمت کی اور یہاں کے باسیوں نے ان عناصر کے خلاف مزاحمت کا شعور پیدا کیا۔ یہ عناصر کبھی جنوبی پنجاب کے باشندوں کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں تو کبھی مختلف سماجی برائیاں پھیلانے والے عناصر کے مددگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ان ناپسندیدہ عناصر کی کثیر تعداد سیاست کے شعبہ سے منسلک ہے۔ جنوبی پنجاب کے اکثر سیاستدانوں کا محور و مرکز عوامی استحصال اور جبری رویے ہیں۔ انہی سیاستدانوں کی بدولت جنوبی پنجاب کا خطہ ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں انتہائی پسماندہ ہے۔

" South Punjab is categorised by poverty of 40 million people living below the Poverty line in Pakistan, an estimated 10 million are in southern Punjab . Poverty levels are between 48 and 64 percent in the poorest four districts- far above the average for Punjab. " 10

جنوبی پنجاب کے سیاستدانوں میں زیادہ تر تعداد کا تعلق قدیم زمانے سے جاگیردارانہ نظام سے ہے۔ جو عوام الناس کے حقوق کی ادائیگی کو ترجیح نہیں دیتے اور عام لوگوں کو اپنے برابر سمجھ کر ان کو حقوق دینے کی بجائے غلام تصور کر کے ان کے حقوق کا استحصال کرتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے اکثر سیاستدان مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہیں۔ یہ سیاستدان اپنے سیاسی قائدین کی حاشیہ برداری میں مصروف رہتے ہیں۔ خطے کے عوام کے لیے سہولیات فراہم کرنے اور مسائل حل کرنے کے لیے توجہ نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے جنوبی پنجاب عوامی استحصال اور سماجی مسائل کا مرکز بن گیا۔ ان عوامل کے خلاف جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اپنے نفع ونقصان کی پرواہ کیے بغیر بے داری شعور کی اپنی سی جدوجہد کی۔ ان کے افسانوں میں سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی اور دیگر سماجی برائیوں کے خلاف مزاحمت بھرپور انداز میں شامل ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے تمام تر شعوری افکار معاشرے کی اصلاح اور سماج کے نا پسندیدہ رویوں کے خلاف اپنے سخت رد عمل کو پیش کیا۔ ان منتخب اردو افسانہ نگاروں نے مصلحت پسندی کو ترک کر کے ظلم وجبر کے سامنے اپنے مکمل شعور وادراک کے ساتھ استحصالی عناصر کی عیارانہ چالوں، استعماریت، جبر واستبداد، ظلم و سفاکیت کے خلاف کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مذاحمت کے چراغ جلائے اور ان کی روشنی میں سامراجی، استحصالی قوتوں کو معاشرے کے سامنے عیاں کر کے رکھ دیا۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنی فکر کے مختلف زاویوں کو استعمال کرتے ہوئے ان ناپسندیدہ عناصر کی ہمہ جہت ریشہ دوانیاں سامنے لائے۔ ان میں سے چند فکری زاویے درج ذیل ہیں۔

i بنیادی انسانی حقوق! مذاحمتی رویوں کا جائزہ

ii آزادی اظہار رائے! مذاحمتی عناصر کا مطالعہ

iii بنیادی جمہوری حقوق! مزاحمت کا تجزیاتی مطالعہ

iv مارشل لاء کے خلاف مزاحمت! افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

اگر مندرجہ بالا عناصر کسی ادیب کی فکر کا خاصہ نہ ہوں تو وہ ادیب کبھی بھی ناموافق اقدار کے خلاف علم مزاحمت بلند نہیں کر سکتا نہ ہی اس کا فکری شعور۔ حساسیت، الفاظ اور قلم جب حرکت میں آتے ہیں تو طاقت ور مزاحمتی

ادب وجود میں آتا ہے۔ یہ خصوصیات جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

الف: بنیادی انسانی حقوق ! مزاحمتی رویوں کا جائزہ

کرہ ارض پر بسنے والے تمام انسان زندگی اور اس کے لوازمات کے حوالے سے یکساں بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ کائنات ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کو یکساں بنیادی حقوق اور سہولتیں عطا کرتا ہے۔ عالمگیر فلسفہ حقوق انسانی کے مطابق کسی بھی خطے یا معاشرے میں انسانی اخلاقی قدریں منصفانہ روایات اور فطری طور پر سماجی زندگی کے مختلف عناصر کا بحیثیت مجموعی مستحکم ہونا ازحد ضروری ہے۔ قومی اور بین الاقوامی قوانین کے تحت حقوق انسانی کے سے اس نظریے کو معاشرے میں لاگو کیا جاتا ہے۔ عرفِ عام میں انسانی حقوق ایک بسیط عنوان ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ایسے حقوق کی نشاندہی کی جائے جو انسان کے بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیے جائیں۔ جدید دنیا میں انسانی حقوق کا تصور دوسری جنگ عظیم کے بعد مرتب کیا گیا۔ اس کی وجہ دو عظیم جنگوں کے نتائج میں عالمی سطح پر کروڑوں انسانوں کا لقمۂ اجل بننا ہے۔ پوری دنیا میں انسانی حقوق کا ایک عالمگیر منشور وضع کیا گیا۔

> ”ہر شخص کسی بھی قسم کے امتیاز جیسے نسل، رنگ، جنس، مذہب، سیاسی یا دیگر رائے، قومی یا معاشرتی اصول، جائیداد، پیدائشی یا دیگر حیثیت کے بغیر اس اعلامیہ میں مذکورہ تمام حقوق اور آزادی کا مستحق ہے۔۔۔ من مانے طور پر کسی شخص کی خلوت، خاندان، گھر یا خط و کتابت میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت و شہرت پر کوئی حملہ کیا جائے گا، ہر شخص کو ایسی مداخلت یا حملے کے خلاف قانون کے تحفظ کا حق حاصل ہوگا۔“11

بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی پوری دنیا کے انسانوں کا حق یہ ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

i	زندگی کے حقوق	ii	آزادی کے حقوق
iii	جائیداد کے حقوق	iv	بحث و مباحثہ کے حقوق
v	کام کرنے کے حقوق	vi	اپنی مرضی کے مذہب پر چلنے کے حقوق
vii	پبلک افیئرز کے حقوق	viii	سیاسی افیئرز کے حقوق۔

یہ حقوق دنیا میں موجود ہر ملک کے حکمران کی ذمہ داری ہے چاہے وہ سیاسی عمل کے تحت حکمران بنے ہوں یا پھر شاہی نظام کے تحت۔ چاہے مارشل لاء ڈکٹیٹر ہوں یا پھر سیاسی مطلق العنان وڈیرا شاہی کی زینت رکھنے والے حکمران ۔ان سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو زندگی کی بنیادی سہولتیں باہم پہنچائیں یوں تو پوری دنیا میں انسانوں کے بنیادی حقوق کا استحصال ہو رہا ہے مگر جنوبی پنجاب عوام کے بنیادی حقوق کو شدت سے پامال کیا جا رہا ہے۔ یہ بنیادی حقوق کی پامالی کبھی مارشل لاء ڈکٹیٹر کے ہاتھوں تو کبھی افسر شاہی کے ہاتھوں، کبھی سیاسی حکمران ملکی عوام کے حقوق کو غصب کرتے ہیں تو کبھی عوام کو اپنا غلام سمجھنے والے جاگیر دار۔ پورے ملک میں عمومی طور پر عوام کے بنیادی حقوق کا استحصال جاری ہے لیکن خصوصی طور پر استحصالی نظام کی شدید زد میں آنے والا خطہ جنوبی پنجاب ہے۔ اس خطے میں سیاستدانوں کی اکثریت جاگیر دارانہ ذہنیت والے موروثی سیاست دانوں کی ہے جو عوام کو اپنے غلام سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں دیتے۔ یہی ذہنیت ان کو عوام کے بنیادی حقوق فراہم کرنے میں آڑے آتی ہے۔ جب بنیادی حقوق تسلسل سے غصب کیے جائیں گے تو یقیناً اپنے حقوق کے لیے کوئی نہ کوئی آواز ضرور بلند ہو گی۔ یہ صدا کبھی تو عوام کی درد رکھنے والے سیاست دانوں کی تقاریر میں اور کبھی شعراء وادباء کی تخلیقات میں سامنے آتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پورے ملک کے مذاحمتی تخلیق کاروں کی طرح جنوبی پنجاب کے ادباء نے، اپنے خطے کی عوام کے لیے نمایاں طور پر آواز اٹھائی۔ خصوصاً جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے ہاں اپنی عوام کے حقوق کے لیے توانا اور مستحکم مزاحمت پائی جاتی ہے۔ جنوبی پنجاب کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والے منتخب اردو افسانہ نگار اپنے طور پر کبھی براہ راست سیاسی دہشت گردوں کو للکارتے رہے تو کبھی علامتی پیرائیہ بیان رکھنے والے افسانوں کی شکل میں حصول استحقاق کے لیے کوشاں رہے۔

آج کا دور سیاسی اجارہ داری کا دور ہے۔ جو جتنا سیاسی لحاظ سے طاقتور ہے اسی قدر زندگی کی سہولیات سے آراستہ ہے۔ بڑے گھر، بڑی گاڑیاں، بڑے کاروبار، عمدہ سفری سہولیات، بہترین تعلیمی سہولیات اور دیگر وسائل حیات پر صرف ان کا حق ہے۔ ان لوگوں کی زندگی مسرتوں کا جھولا جھولتے گزرتی ہے۔ یہ لوگ بیمار بھی ہو جائیں تو علاج معالجے کے معاملات ملک کے دوسرے خطوں یا باہر کے ممالک میں ہوتے ہیں کیوں کہ جنوبی پنجاب میں ایک بھی ایسا ہسپتال نہیں کہ جس میں یہ اپنا علاج کروا سکیں ۔ عوام الناس کو صحت کی بنیادی سہولیات فراہم کرنا ریاست اور حکمرانوں کا اولین فریضہ ہے۔ مگر جنوبی پنجاب میں قائم شدہ سرکاری ہسپتال صحت کی سہولتیں کماحقہ مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان ہسپتالوں میں کبھی عملہ نہیں ہوتا تو کبھی دوائیں نہیں ہوتیں۔ کبھی ضروری مشینری کی عدم دستیابی ہوتی ہے تو کبھی ڈاکٹروں نے ہڑتال کر رکھی ہوتی ہے۔ اگر عملہ ہوتا بھی ہے تب بھی عوام کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہسپتال کا عملہ مریضوں کی نہ تو مناسب دیکھ بھال کرتا ہے اور نہ ہی درست علاج معالجہ

۔ غریب بے چارا اکثر و بیشتر بے بسی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ سیاستدان اپنے لیے تو دنیا کے کسی بھی ملک سے طبّی سہولیات حاصل کر سکتے ہیں، مگر جس عوام کے بل بوتے پر وہ اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں وہی عوام صحت کی سہولیات کی عدم دستیابی پر تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ مفلوک الحال افراد جن کا سرکاری ہسپتالوں میں علاج نہیں ہو پاتا مجبوراً انہوں نے نجی ہسپتالوں کا رخ کیا۔ وہاں بہت زیادہ رقم اور وسائل نہ ہونے کے سبب علاج سے محروم رہے۔ ایسے حالات میں مریض کو اپنی موت نظر آ رہی ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ صحت و تندرستی اور علاج معالجے کی سہولیات تو میرے مقدر میں نہیں کم از کم مرنا تو یقیناً مقدر ہے۔ ایسے میں وہ اپنی موت کی تیاری کے لیے کفن خریدنے کی کوشش کرتا ہے مگر کفن بھی مہنگا ہے۔ غریب جائے تو کہاں جائے۔ جاوید اختر بھٹی ان متعصب اور بے حس سیاستدانوں کے اس سنگ دلانہ رویے کے متعلق اپنے افسانہ ''آخری نوٹ'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں دوائیاں خریدنے کے لیے میڈیکل سٹور پر گیا نسخہ دکاندار کو دیا تو دکاندار نے مجھے گھورا اور پھر حساب لگا کر کہنے لگا ''بچھتر روپے'' میں نے انکار کے انداز میں سر ہلا دیا اور اس نے کاغذ کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہاں سے میں سیدھا کپڑے کی مارکیٹ گیا۔۔۔۔ دکاندار بڑے آداب سے پیش آیا، اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بجھے بجھے سے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے کہا کیا چاہیئے؟ میں نے کہا 'ایک کفن'۔'' 12

جنوبی پنجاب صحت و تعلیم کی بنیادی سہولیات کے حوالے سے آج بھی پاکستان میں انتہائی نچلے درجے پر ہے۔ خصوصاً پہاڑی، دریائی اور تھل کے علاقوں میں ذرائع آمد و رفت اور صحت کی سہولیات انتہائی اندوہ ناک ہیں۔ پنجاب کی سیاسی اشرافیہ نے جنوبی پنجاب کے وسائل کو یہاں کے سیاستدانوں کے ذاتی مفادات اور نااہلی کے پیش نظر اپنے مختص کردہ محبوب علاقوں تک محدود کر رکھا ہے۔ وسائل کا مکمل مرکز ان کے پسندیدہ علاقے ہیں جہاں بلا ضرورت مہنگے مہنگے منصوبوں پر قومی دولت لوٹائی جا رہی ہے۔ بعض مقامات پر غیر منافع بخش میٹرو بس منصوبے اور اورنج ٹرین چلائی جا رہی ہیں اور جنوبی پنجاب میں ہموار کچے راستے تک نہیں ہیں۔ ایمرجنسی کی صورت میں سواری اور قریب کے علاقے میں معیاری ہسپتال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس خطے کے ان پسماندہ علاقوں کے لوگ مناسب ذرائع آمد و رفت اور سفری سہولیات کے نہ ہونے سے کسی بھی ہنگامی صورتحال میں بروقت ہسپتالوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ جس کی وجہ سے کئی قیمتی جانیں زندگی کی بازی ہار جاتی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کے لیے یہ مسائل اور بھی زیادہ دردناک ہیں۔ کئی خواتین بروقت ہسپتالوں تک نہ پہنچ سکنے یا مناسب راستے اور سواری نہ ہونے سے انتہائی تکلیف میں سفر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ان علاقوں میں صحت کے حوالے سے اتنا شعور نہیں ہوتا، لوگ اس طرح کی نازک صورتحال سے درست انداز میں عہدہ برآ نہیں ہو پاتے۔ جس کی وجہ سے ماں اور بچہ دونوں کی زندگی کو

خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ بسااوقات ماں زندگی کی بازی ہار جاتی ہے اور بعض اوقات دنیا میں آنے والا نونہال دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی مرجھا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ متعصب سیاستدانوں کا عوامی وسائل پر قابض ہو کر اس خطے میں احساس محرومی پیدا کرنا ہے۔ اسی متعصبانہ رویے کے باعث جنوبی پنجاب کے عوام آج بھی قدیم عہد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ دردانہ نوشن خان نے جنوبی پنجاب اور اس کے باشندوں کے احساس محرومی اور بنیادی سہولیات کی عدم موجودگی کی بنا پر پیش آنے والی تکالیف کو اپنے افسانہ ''میٹرو بس'' میں اجاگر کرتے ہوئے اہل سیاست کی توجہ اس طرف مبذول کراتی ہیں :

> ''ڈاچی کے پیچھے ریڑھے میں دری بچھا کر اوپر پرانے کپڑے کا سائبان کھینچ کر گویا آرام دہ ایمبولنس تیار ہوگئی۔ چاچی تو بخار کے سبب نہ گئی۔ ریڑھے میں چاچا مجید (خاوند) کے علاوہ برادری کی کچھ عورتیں جو اپنے اپنے کاموں سے جا رہی تھیں۔ ڈاچی اچھلتی، جمپ لگتا، عورتیں، ہنسنے لگتیں آدھا راستہ طے نہ ہوا تھا۔ کہ زینت کو درد شروع ہو گیا۔ مجید پریشانی سے بار بار مڑ کر دیکھتا مگر عورتوں نے سمجھایا کہ ایسا ہوتا رہتا ہے کسی نے اس کی ٹانگیں دبا دیں کسی نے اسکے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ زینت کا درد بڑھتا گیا ہر جھٹکے پر ''ہائے امی'' کی آواز نکلتی، عورتیں صبر کرنے کی تلقین کر کے آپس میں تبصرے کرتیں کہ ابھی تو آٹھواں لگا ہے، پہلو ٹھی ہے انجان اناڑی ہے یوں ہی غل ڈال رہی ہے۔'' 13

سیاست کا عمومی مطلب عوامی خدمت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مگر دور جدید کی سیاست عوامی خدمت کی بجائے سیاسی گاڈ فادر اپنے آپ کی خدمت کرواتے ہیں۔ عوام کو ان کی بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی بجائے ان کے بنیادی حقوق پہ ڈاکہ زنی کرتے ہیں۔ یہ سیاستدان اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھ کر سسکتے بلکتے غریب عوام کو خوش حال بنانے، انہیں پیٹ کی روٹیاں دینے، صحت کی سہولیات، سڑکیں، گلیاں، تعلیم اور صاف پانی مہیا کرنے اسی طرح تمام بنیادی انسانی حقوق فراہم کرنے کے نعرے لگاتے آئے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر سیاست کرنے والے سیاستدان یا سیاسی تنظیمیں ہیں ان کا اصل مقصد اسمبلی کے ایوانوں میں بیٹھ کر اقتدار کی قوت کے ساتھ پر تعیش زندگی بسر کرنا ہے۔ ان کو عوام کا کائی احساس اور نہ ہی عوام سے ہمدردی ہے۔ یہ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر اس کی طاقت سے مختلف قسم کی بدعنوانیوں اور فریب کاریوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر عوامی فلاح کے منصوبوں کے نام پر جاری ہونے والے فنڈز یا عوامی بہبود کے منصوبوں کے لیے وقف ہونے والی اراضی پر غاصبانہ قبضہ جما لیتے ہیں۔ کبھی تعلیمی سہولتوں کے منصوبوں کے لیے وقف زمینوں پر تو کبھی صحت کی سہولتوں کے لیے ہسپتال قائم کرنے کے لیے دی گئی زمینوں پر قبضہ مافیا کی صورت

میں ان منصوبوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ایک بد عنوان وزیر کا تذکرہ کرتے ہوئے احمد اعجاز اپنے افسانہ ''ابنِ مریم ہوا کرے کوئی''میں رقمطراز ہیں:

''گورنمنٹ کالج کے اس وسیع میدان میں جس پر شہر بھر کے لڑکے کھیل کھیلا کرتے، ایک مقامی بااثر شخص جو کہ ان دنوں وفاقی وزیر تھا، نے قبضہ جما لیا۔ دراصل کالج کے اس حصہ پر جس پر قبضہ کیا گیا سرکاری ہسپتال تعمیر کیا جارہا تھااور ہسپتال کے لیے گورنمنٹ نے جو جگہ منظور کی اس پر وزیر صاحب نے خود قبضہ جما لیا کہ آنے والے وقت میں اس کئی ایکڑ پہ مشتمل زمین کی قیمت کروڑوں میں ہونے والی تھی۔ تعلیمی ادارہ جو معاشرے کی تعمیر وترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، پامال کر دیا گیا۔کالج کی اراضی ہتھیانے،اس پر ہسپتال تعمیر کروانے اور ہسپتال والی جگہ کو اپنے نام کروانے کے اس سارے گھناؤنے عمل میں وزیر صاحب کو اوپر سے آشیر باد تھی۔یوں تمام معاملات بہ احسن خوبی انجام پائے۔ مقامی سطح پر صحافیوں،اساتذہ اور دانشوروں نے اس عظیم ظلم کے خلاف جو تھوڑی بہت آواز اٹھائی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔''14

اکیسویں صدی کے اس دور عروج میں بھی جنوبی پنجاب کو تعلیمی حوالے سے انتہائی پس ماندہ رکھا گیا ہے۔سکول یا کالج تو ہیں مگر چار دیواری نہیں، کمرے تو ہیں مگر ان کی چھتیں نہیں، طلبہ وطالبات تو ہیں مگر ان کے لیے بینچ یا کرسیاں نہیں ہیں۔ ناکافی وسائل کی بنا پر جنوبی پنجاب کے لوگوں میں احساس محرومی بڑھ گیا۔ تعلیمی سہولیات کی عدم دستیابی پر ان کے بچوں کا مستقبل تاریک ہے۔وہ نوحہ کناں ہیں اے ارباب اختیار کیا ہم جنوبی پنجاب یا پاکستان کے باسی نہیں، کیا ہمارااور ہمارے بچوں کا یہاں کے وسائل پر کوئی حق نہیں، کیا ہم انسان نہیں،آخر ہمارا قصور کیا ہے۔؟اس خطے کو یہاں کے جاگیر دار اور سیاستدانوں نے ہی پسماندہ رکھا ہے۔اس خطے کی عوام کو اگر تعلیم مل گئی تو شعور آجائے گا۔اگر شعور آیا تو ان سیاستدانوں کی موروثی غلامی کے طوق کو گردن سے نکال پھینکیں گے۔اس لیے اس خطے کے سیاستدان جان بوجھ کر یہاں کے لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھے ہوئے ہیں اور انہیں تعلیمی سہولیات کا استحقاق نہیں دیتے۔کیوں کہ ان کے اپنے بچے دولت کی فراوانی سے ہمہ قسمی سہولیات خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ مگر غریب،مزدور، مفلس وقلاش عوام کہاں سے اپنے بچوں کے لیے یہ سہولتیں فراہم کرے۔دردانہ نوشین خان جنوبی پنجاب کے اس دکھ کا نوحہ اپنے افسانہ ''میٹرو بس''میں دو سہیلیوں کے مکالمے کی صورت میں پیش کرتی ہیں:

''زینت کیا خواب ہیں تمہارے؟یہ خواب تعبیر کی منازل میں کیوں نہیں پہنچتے؟'' لائبہ احمد کا سوال سادہ نہ سہی مگر زینت کے قابل تھا۔۔۔ ''لائبہ گاؤں میں رہنے والوں کا بھی

جی چاہتا ہے کہ ان کی گلیاں پکی ہوں بجلی کا سامان ڈبوں میں بند رکھنے کو نہ خرید ا جائے۔ صرف تاریں اور کھمبے نہ ہوں بجلی بھی ہو، پارک ہوں، صفائی کا انتظام ہو، ہمارے بھی سکول اچھے معیار کے ہوں وہاں بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور لائبریریاں اور لیب ہوں ۔۔۔ ہمیں بھی اکیسویں صدی کا انسان سمجھا جائے۔ ہمیں سو سال کے پہلے کی زندگی پر نہ رکھا جائے۔۔۔ بات یہ بھی ہے کہ ووٹ جس کو بھی دیں۔ جیت کر سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔۔۔ عوام کے خوابوں کی کسی کو پرواہ رہتی ہے نہ یاد وہ بھی اس سے متفق تھیں۔"15

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جنوبی پنجاب کی عوام کو درست تعلیمی سہولیات میسر نہیں ہیں۔ آبادی کے تناسب سے سرکاری تعلیمی ادارے بہت کم ہیں۔ خصوصاً تعلیمی سہولیات کی کیفیت انتہائی کرب ناک ہے۔ اس خطے میں چند اضلاع کے علاوہ باقی اضلاع میں نہ تو کسی یونیورسٹی کا نام ونشان ہے اور نہ ہی میڈیکل کالج ہیں۔ جو کالج/یونیورسٹیاں ہیں، وہ بھی چند مخصوص ضلعی شہروں میں ہیں، جو بہت سے شہروں، قصبوں اور مختلف دیہی علاقوں سے کافی فاصلے پر ہیں۔ ایسے حالات میں اکثر لوگ اپنے بچوں کو پرائمری، مڈل یا میٹرک سے آگے وسائل نہ ہونے کی بنیاد پر تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے بچوں کو مختلف کام کاج، ہنر یا مزدوری پے لگا دیتے ہیں۔ اس طرح کئی ذہین، قابل ترین بچے تعلیم کے زیور سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ جنوبی پنجاب کا پورا معاشرہ بھی ان کی ذہانت سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی طالب علم آگے بڑھنے کی جرات کرتا بھی ہے تو بھیانک مسائل اپنا خوفناک منہ کھولے اس کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ ذرائع آمدورفت سے ہے۔ کیونکہ ان کے پاس نہ تو ذاتی سواری ہوتی ہے اور نہ ہی کرایہ ادا کرنے کے لیے مالی حالت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ وہ روزانہ کا کرایہ ادا کر سکیں۔ اس ناچاری اور بے بسی کا حل ان پس ماندہ علاقوں کے بچے یوں نکالتے ہیں کہ بحیثیت طالب علم ان کو ملنے والی سہولت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی ان کے لیے اکثر انتہائی تکلیف دہ بلکہ مخدوش ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بچے جن بسوں اور گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں ان گاڑیوں کے ڈرائیور اور کنڈیکٹرز ان کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرتے ہیں۔ گاڑی کا عملہ اکثر و بیشتر گاڑی پر سوار نہیں ہونے دیتا لیکن طلباء کالج وقت پر پہنچنے کے چکر میں ان گاڑیوں کے پائیدان یا سیڑھیوں سے لٹک جاتے ہیں۔ یہ خوفناک بلکہ انتہائی خطرناک منظر ہوتا ہے۔ راستے میں جہاں کہیں ناہموار اور کٹھن راستہ آتا ہے تو بس کو لگنے والے جھٹکوں کے سبب کئی طلباء بسوں سے گر کر عمر بھر کی معذوری کا شکار ہو جاتے ہیں یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بعض تعلیمی اداروں کو طلباء کو آنے جانے کے لیے بسیں بھی مہیا کی گئی ہیں مگر طلباء کی تعداد اور ان بسوں کے تناسب کو دیکھا جائے تو یہ سہولت اونٹ کے منہ میں زیرا کے مصداق ہے، اس لیے اکثر طلباء اپنی تعلیمی جدوجہد کے

لیے بسوں کے اطراف میں لٹک کر جاتے ہیں۔ اس احساس محرومی کو اجاگر کرتا در دانہ نوشین خان کا ایک افسانہ " کیکروں کے گلاب "ہے۔ جس میں یہاں کے طلباء کے اس گھمبیر مسئلے کو سامنے لایا گیا ہے۔

"ہماری گورنمنٹ کی نظر ہمارے مسائل پر کیوں نہیں جاتی ۔۔۔ یار کیا یہ گورنمنٹ کا فرض نہیں کہ طلبا کو سکول کالج جانے کی سہولت فراہم کرے۔۔۔ "راشد لمبوترا ڈبل ڈیکر کی طرح جھولتا اونٹ کی طرح رنجیدہ تھا۔ سڑک کنارے کھڑے کھڑے ٹانگیں اینٹھ گئیں تو زبانیں متحرک ہو گئیں۔ کوسٹر کو بریک لگانا پڑی۔ بریک کا اشارہ تھا۔ مگر پہیے رکتے دیکھ کر لڑکے گیٹ پر ٹوٹ پڑے۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ بند کا بند رہا۔ لڑکے سیڑھی پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ عمران نے بند دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اپنے پیر ٹکانے کی جگہ بنائی۔ ایک پاؤں بمشکل ٹکا تھا اور وہ بھی بد قسمتی سے ایک ہوائی چپل والے لڑکے کے پاؤں پر پڑ گیا جس کے انگوٹھے پر زخم تھا، اس نے جو تڑپ کر پاؤں کھینچا، عمران غیر متوازن ہو گیا۔ اور پھر پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کا ہاتھ چھوٹا، کب وہ نیچے گرا اور چلتی ہوئی کوسٹر کے پچھلے پہیے اس کی ٹانگوں پر ٹنوں وزن سے دندناتے گئے۔ ایک لمبی اذیت ناک چیخ ۔۔۔ لڑکوں کی آوازیں ۔۔۔ شور ۔۔۔ سڑک نے خون پہن لیا۔" 16

اس علاقے کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا گیا ہے۔ جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں اور جاگیرداروں نے یہاں کی عوام کو سہولیات دینے کی بجائے مسائل میں الجھایا ہوا ہے۔ ترقیاتی فنڈز اور منصوبوں کا رخ جنوبی پنجاب کی طرف نہیں ہونے دیتے۔

" Poverty is the biggest issue " of the Southerners since flow of money is from the south to the north in the province . Lahorites have been given Metro Bus and orange Train along with many bridges, roads and underpasses while people in the south are without such facilities " (17)

جنوبی پنجاب میں ہر شعبہ حیات کا احوال انتہائی دگرگوں ہے۔ کوئی بھی شعبہ درست طور پر کام نہیں کر رہا، اس کی سب سے بڑی وجہ ان انتظامی اداروں میں سیاستدانوں کی دخل اندازی کا حق اس شعبے کے متعلق افراد کو ہے۔ مگر سیاسی اقتدار کے نشے میں بدمست سیاستدان ہر ادارے کو اپنی ذاتی ملکیت اور اس میں کام کرنے والوں کو اپنے زر خرید

غلام اور لونڈیاں سمجھتے ہیں۔ یہ سیاستدان اپنی بدطینتی کی وجہ سے ہر محکمہ کے ہر معاملے میں دخل دینا اور اپنی بات منوانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس خطے کے عوام کی زبان پر یہی شکوہ ہے کہ ہر ادارے میں ہر جگہ سیاستدانوں کا سکہ چلتا ہے۔ جب تک متعلقہ سیاستدان کی سفارش لے کر نہیں جاؤ گے تو معاملہ حل نہیں ہو گا۔ یہ سفارش مختلف طریقوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ متعلقہ سیاستدان کا کوئی قریبی عزیز یا کوئی لنگوٹیا یار اس کو سفارش کر دے یعنی یہ کہ سفارش کے لیے بھی سفارش کروانی پڑتی ہے۔ یہ سفارش متعلقہ سیاستدان کی جیب گرم کر کے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پھر آپ میں اہلیت ہے یا نہیں یا آپ کوئی ناجائز کام کرانا چاہتے ہیں تب بھی موصوف سیاستدان کے سیاسی اثر کی وجہ سے ہر بند دروازہ کھلتا چلا جائے گا۔ یہ چلن عام ہو گیا ہے، یہاں میرٹ کا کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر آپ مضبوط سفارشی رکھتے ہیں تو پھر کوئی بھی رکاوٹ آپ کا راستہ نہیں روک سکتی۔ یہ کیفیت تقریباً ہر محکمے میں واضح نظر آتی ہے۔ دیگر شعبہ جات کی طرح تعلیم جیسے مقدس شعبے میں بھی اقرباء پروری، خویش نوازی اور سیاسی تعلقات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مگر اس کے لیے بھی تعلیم جیسا شعبہ جو ہماری آنے والی نسل کی تعمیر و تشکیل اور کردار سازی کرتا ہے یہ بدعنوان سیاستدان اس مقدس شعبے کو بھی اپنی بدعنوانی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ جعلی اسناد کے حامل نااہل افراد دیگر طاقت ور سفارش رکھنے والے تعلیم کے شعبے میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ محنتی، قابل اور ایماندار افراد میرٹ پر پورا اترنے کے باوجود نوکری سے محروم رہ کر وہی راستوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ آپ چاہے جتنے بھی قابل اور میرٹ پر پورا پورا اترنے والے ہوں مگر معیاری ملازمت کے لیے آپ کے پاس تگڑی سفارش ہونا ازحد لازمی ہے۔ ورنہ نوکری کے خواب ہی دیکھتے رہ جاؤ۔

دردانہ نوشین خان نے اس حقیقت کا واشگاف الفاظ میں اپنے افسانہ ''بجوگ'' میں یوں اظہار کیا:

> ''کیا تیر مار لو گی یار! پتا ہے آج کتنا رش تھا۔ چھ سیٹیں اور لگ بھگ تین ہزار Candidates نوکری ایسے نہیں ملتی۔ ریفرنس چلتے ہیں۔ ''ریفرنس کوئی آج کی چیز نہیں ہے۔ یہ پہلے بھی ہوا کرتے تھے مگر میرٹ ہر دور میں جگہ بنالیتا ہے۔۔۔ ''اچھا تہجد کا میرٹ تھا یا ریفرنس؟ حضرت عمر فاروق کے دور کی باتیں نہ کرو۔ یہ میرٹ بھی آج کل تھوک کے بھاؤ ہے۔''18

دردانہ نوشین خان نے جنوبی پنجاب کی عوام کے دکھ اور مسائل کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ اس خطے کی ناہمواریاں اور ناانصافیاں اس کا موضوع ہیں۔ احمد سجاد بابر لکھتے ہیں:

> ''دردانہ نوشین قلم و قرطاس سے جڑا ایک معتبر نام اور قابل تکریم حوالہ ہے جن کے قلم کا سفر دہائیوں پر محیط ہے۔ لفظ کی کو ملتا، قلم کی نشریت، موضوع کی انفرادیت ان کا سب سے بڑا تعارف ہے۔ مجھے یہ اعتراض کرنے میں کوئی عار نہیں کہ دردانہ نوشین کی

تحریر کے اندر تحریر ہوتی ہے۔ان کی بات کو رک کر غور سے دو بارہ سہ بارہ پڑھ کر ان کے جملوں کی سمجھ آتی ہے۔ حرف کی پٹاری سے اسرار اور بھید جھانکتے ہیں۔ حرف کی پٹاری کھول دی جائے تو فہم وادراک کا ناگ ڈس کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ پٹاری نہ کھولی جائے تو ذہن کا کاسہ خالی رہ جاتا ہے۔"19

انصاف ملتا نہیں بکتا ہے، جس کے پاس زیادہ بولی لگانے کے لیے دولت ہوتی ہے ایک کوٹھے کی طوائف کی طرح اس کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ بالخصوص جنوبی پنجاب کا بدعنوان سیاسی طبقہ جس نے قانون اور انصاف کو اپنی رکھیل بنا رکھا ہے۔ وہ جنوبی پنجاب اور اس کی عوام کا استحصال کر کے پورے خطے کی دولت کو لوٹ کھسوٹ کر کے اب بھی اعلیٰ رتبہ پر براجمان ہے۔ سیاست کی منڈی میں یہ سب لوگ ایک جیسے ہیں۔ اگر کبھی کوئی قوم کا ہمدرد سیاستدان اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کر لے اور ان بدعنوان عناصر کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرے تو یہ عناصر چالاق کوّے کی طرح اڑان بھر کر دور دیسوں میں گھونسلے بنا لیتے ہیں۔ تاوقتیکہ اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت اقتدار کے ایوانوں میں نہ پہنچ جائے۔ جیسے ہی اپنے ہم نسل اقتدار نشین ہوتے ہیں تو یہ بدعنوان عناصر مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے خم ٹھونک کر سر زمین پاک پر نازل ہو جاتے ہیں۔ چند دن عدالت، گواہ اور انصاف کی نورا کشتی چلتی ہے، یہ بدعنوان عناصر ہر گناہ سے بری الذمہ قرار پاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بے گناہ ثابت ہوتے ہیں بلکہ معصومیت اور مظلومیت کے تمغے سمیٹے ایک بار پھر عوام کے درمیان ان کے استحصال کے لیے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے داغ دھونے کے لیے میڈیا پر باقاعدہ سچا اور کھرا ہونے کی تشہیری مہم چلائی جاتی ہے۔ یوں یہ سماج کے لٹیرے قوم و ملک کو پھر سے لوٹنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔

"گرفتاری کے ٹھیک پینتیس دن بعد، ملک کی ضمانت ہو گئی۔ کوئی الزام بھی اس کے سر ثابت نہ ہو سکا۔ لوٹ مار غبن کو چھوڑیں، وہ تو بھوسے کے تیلے کا روادار بھی نہ گردانا گیا۔ معلوم نہیں کیسے داستانے ہاتھوں پہ چڑھائے لوٹا تھا کہ خامیاں، خوبیاں بن گئیں اور سیاسی، چمکدار سفیدی۔ اب نیا دزکا (کبوتر پکڑنے کا جال) نئی چال، نیا بھیس۔۔۔ ایمانداری کا سرٹیفیکیٹ سینے پہ سجا، نیک نامی کا پنکھ طرہ میں اڑس، ملک اپنی شہر والی کوٹھی میں آن بیٹھا تاکہ رسول پور کچھ اور دہک جائے۔۔۔ اس لیے کہ دو دن بعد ملک نے وہاں کی مقامی کچہری میں، بطور امیدوار قومی اسمبلی کاغذات نامزدگی داخل کرنے تھے۔"20

معاشرے میں عزت کی زندگی بسر کرنا اور جان و مال کا تحفظ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ زندگی، جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ مگر یہ ذمہ داری تو تب نبھائی جائے گی جب ملک و قوم کی باگ ڈور سوز ملت اور قوم کے احساس کی دولت سے مالا مال ارباب اختیارات کے ہاتھ ہو گی۔ ادارے کسی سیاستدان یا بیوروکریٹ کے در کی لونڈی یا تماشبین اشاروں پر ناچنے والی طوائف کے مانند نہ ہوں گے۔ وہ صرف اور صرف عوام کے حقوق کی پاسبانی کرنے والے ہوں گے۔ امن و امان کی خاطر عادلانہ نظام میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہاں کے اکثر سیاستدان حق اور انصاف کے راستے میں نہ صرف دیوار بن کر کھڑے ہیں بلکہ انصاف کی بجائے ناانصافی اور ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ انہوں نے جنوبی پنجاب کے لاچار اور غریب لوگوں کو اپنے ظلم و جبر کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ یہ لوگ پولیس اور عدالتی نظام کو اپنی چشم ابرو کے اشاروں پر چلاتے ہیں۔ پولیس کا محکمہ جس کا اولین فریضہ معاشرے میں امن و سکون قائم رکھنا اور قانون و انصاف کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ وہ محکمہ بجائے اپنے فرائض کی کماحقہ بجاآوری کے ان سیاستدانوں کے در کا غلام بنا ہے۔ اگر کسی غریب کے ہاں کوئی قتل یا ڈکیتی ہو جاتی ہے تو اس کی ایف آئی آر لکھوانے کے لیے بھی تگڑی رشوت یا اعلیٰ سطح کی سیاسی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر یہ دونوں ذرائع دستیاب نہیں تو یہ مقدمہ کھوہ کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مقدمہ درج کر بھی لیا جائے تو بھی غصب شدہ مال یا مقتول کا قاتل دستیاب نہیں ہو گا۔ کیوں کہ جب تک آپ قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کاروں کے منہ موتیوں سے نہیں بھریں گے تو انصاف کا حصول آپ کے لیے ایک محض ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ یہاں کے سیاستدان قانون کی راہ میں روڑے اٹکانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر انہوں نے پولیس کے محکمے کو صرف اپنی دھونس جمانے کے لئے معاشرے میں استعمال کر رکھا ہوتا ہے۔ سیاسی مخالفین کو دیوار سے لگانا، اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والے کو تباہ کرنا ان سب معاملات میں پولیس کو ملوث کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ان نام نہاد سیاستدانوں کا اوڑھنا بچھونا معاشرے میں خوف ہراس کی فضا پیدا کر کے اپنے اقتدار کو طوالت دینا ہے۔ ان سیاستدانوں کی بدولت غریب کو انصاف نہیں ملتا۔ غریب کو انصاف کی راہ تکتے اور حصول انصاف کا انتظار کرتے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند جاتا ہے۔ مگر انصاف کی دیوی اس پر مہربان نہیں ہوتی۔ آج انصاف کے حصول کے لیے نوحؑ کی عمر، قارون جیسا خزانہ اور ایوبؑ جیسا صبر درکار ہے۔ ریاستی اداروں خصوصاً پولیس کے محکمے کو سیاست دانوں کے اپنے جبر کی ریاست کو قائم و دائم رکھنے کے لیے استعمال کے حوالے سے علی تنہا اپنے افسانہ ''سرخ رنگ'' میں ایک ضعیف العمر بوڑھے کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے جنوبی پنجاب کے غریب اور کمزور عوام کو انصاف کے لیے لڑتے جان کی بازی ہار جانے کے تناظر میں پیش کرتے ہیں :

"میں اور عبداللطیف دونوں گئے تھے۔ ایف آئی آر کے بعد۔ تفتیش بھی دیکھتا رہا ہوں۔ پولیس پر، بہت دباؤ ہے۔ اس لیے وہ درست ڈائریکشن میں کام کر رہے ہیں۔ قاتل کو، آٹھ دس روز میں گرفتار کر لیا جائے گا۔"، "یار، میں جانتا ہوں تم فوجداری مقدمات میں اعلیٰ ریکارڈ رکھتے ہو۔ مگر میرا خیال ہے پولیس، کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ وہ روزانہ جھوٹ بول کے چلے جاتے ہیں۔ حادثے کو آج دسواں دن ہے۔ اور سراغ نہیں مل رہا۔" 21

سیاسی ریشہ دوانیاں صرف شہری او متمدن علاقوں تک محدود نہیں بلکہ ان بے حس، ظالم سیاستدانوں نے پس ماندہ دیہاتوں اور چولستان کے سادہ لوح عوام کو بھی اپنی سیاسی فریب کاریوں کا نشانہ بنایا۔ چولستان کا وسیع صحرا جو زیادہ تر صحرائی ٹیلوں اور غیر آباد زمین پر مشتمل ہے۔ یہاں کے عوام زندگی کی بنیادی سہولیات کو ترستے ہوئے نظر آتی ہیں۔ صحت تعلیم اور پینے کا صاف پانی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ مگر اس خطے میں صحرا کے باسی اکیسویں صدی عیسوی کے اس جدید دور میں بھی پتھر کے دور کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ صحت و تعلیم کی سہولیات تو رہیں ایک طرف اس خطے کے باسیوں کو پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں۔ ان علاقوں میں دریائی اور نہری نظام نہ ہونے سے ان کا آبی انحصار صرف اور صرف بارشوں پر ہوتا ہے۔ شدید گرم موسم میں انسان تو انسان چرند پرند بھی پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ کیچڑ آلود زہریلا پانی پینے سے اکثر و بیشتر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں چولستان کے باسی برساتی ٹوبوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کا سیاستدان الیکشن کے موقع پر عوام کے سامنے بلند و بانگ دعوے پیش کرتا نظر آتا ہے۔ انہیں بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے حوالے سے فریب کاری اور دغہ بازی کے جال بچھاتا ہے۔ مگر کامیاب ہوتے ہی اس خطے کی عوام سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ چولستان کے باسی اپنی قدیم بدنصیبی کے ساتھ بدستور زندگی گزرانے پر مجبور ہیں۔ غریب عوام کو پینے کا صاف پانی بھی مہیا نہیں لیکن سیاستدان اپنے اللے تللوں اور شاہ خرچیوں میں مشغول ہیں۔ انہیں اس پورے خطے کے مصیبت زدہ باشندوں کا رتی بھر بھی احساس نہیں ہے۔ محمد حفیظ خان اپنے افسانہ "بوتے" میں چولستانی عوام کو رضوان اور اس کے ساتھی کے روپ میں پیش کرتے ہوئے علامتی انداز میں اپنے صحرا کے زندگی کی تلاش میں سرگرداں باسیوں کے کھو جانے پر ان کی تلاش میں جانے والے افراد کے خود بھوک اور پیاس سے جاں بلب استعارے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ پیاس، بدحالی صرف آج کے لوگوں تک محدود نہیں بلکہ ان کے بزرگوں کی روحیں بھی اس استحصالی نظام پر نوحہ کناں نظر آتی ہیں۔ موجودہ نسل اپنے پرکھوں کے اس بھیانک انجام پر خوف زدہ ہے۔

"تم، تم رضوان بے وقوف ہو۔۔۔احمق ہو۔۔۔ وہ دیکھو، وہ دیکھ روپا آرہا ہے۔۔۔روپا آرہا ہے۔۔۔رضوان وہ ہمیں مار ڈالے گا، وہ ہمیں مار ڈالے گا، رضوان، وہ ہمارے لہو سے اپنی صدیوں کی پیاس بجھائے گا۔۔۔بھاگ چلو رضوان، تم بھی بھاگ چلو" الطاف کی چیخیں ریت کے ٹیلوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ پوری روہی (صحرائے چولستان) میں، سوائے الطاف کی چیخوں کے اور کوئی آواز ہی باقی نہیں رہی۔ جس سمت سے بھی الطاف کی آواز آتی سنائی دیتی، گماں یہی ہوتا کہ روپے کی روح اس کے تعاقب میں ہے۔"22

سیاسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے جتنے بھی لوگ ہیں، وہ دوران سفر ان کی گاڑی میں آنے والے عام لوگ جن میں چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والے افراد، بھکاری اور بس کے خدمت گار ہوتے ہیں۔ یہ سیاسی لوگ ان کی کسمپرسی اور بدحالی پر ذرا بھی رحم نہیں کرتے، بہروپ بدل بدل کر ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اس سب کے لیے وہ مختلف سیاسی کھیل کھیلتے ہیں۔ مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عوام کے سامنے باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔، ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ سب عوام کے لیے دکھاوا ہوتا ہے تاکہ وہ عوامی ہمدردی سمیٹ سکیں۔ یہ سیاستدان / حکمران یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں سخت فیصلے کرنا ہوں گے۔ لیکن یہ سخت فیصلے صرف عوام پر ظلم ڈھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان سے سیاستدانوں کے ذاتی، سیاسی کھیل پر کچھ اثرات نہیں پڑتے۔ عوام کو قربانیاں دینے پر مائل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف درباری مقررین، خطباء اور بعض سرکاری زبان منہ میں رکھنے والے مذہبی پیشوائوں کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ عوام ان مظالم کو خدا کی مشیت سمجھ کر قبول کرلے۔ یہ طبقہ اپنے سیاسی کھیل کے لیے کسی حد تک بھی گر سکتا ہے۔ مہنگائی اور جابرانہ پالیسیوں کے خلاف مزاحمت واحتجاج کرنے والے افراد کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک کرتے ہیں۔ عوام حقوق کی بجائے لاٹھی اور گولی کی حقدار بن کر بعض اوقات جان تک کی بازی ہار جاتی ہے۔ عام طور پر یہ سیاست دان کہتے ہیں کہ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال کرتے ہیں۔ اس بات کو واضح کرتے ہوئے انوار احمد اپنے افسانہ "آخرت ایکسریس" میں لکھتے ہیں:

"مگر وزیراعظم نے بے چینی سے وزیر مذہبی امور کی طرف دیکھا اور کہا" یہ بجٹ سپیچ آپ مکمل کریں گے، قوم کو قربانیوں کے لیے تیار کرنا ہے، اس میں اسلام کا فلسفہ قربانی دیکھیے، وہ حضرت ابراہیم اور حضرت امام حسین والے ریفرنسز۔" وزیر ریلوے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "آخرت ایکسپریس کامیابی سے اپنی منزل کی طرف جارہی ہے۔"23

مختلف النوع سیاست دان سیاست کا لبادہ اوڑھ کر اقتدار کے ایوانوں میں جا گھسے ہیں۔ ان میں سے اکثر سیاست دان سفاک، بے حس، قومی مفاد کے احساسات سے محروم اور جنوبی پنجاب کی عوام کے حق میں درندہ ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی عیش و عشرت سے واسطہ ہوتا ہے۔ اس خطے کی عوام کس کرب اور اندوہ سے گزر رہی ہے، عوام کے حال کا ان ظالم و جابر سیاست دانوں کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عوام الناس کو زندگی کا حق رکھنے والے انسانوں کی بجائے محض گنتی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس خطے میں ناگہانی آفات کا تناسب بہت زیادہ ہے، ہر سال سیلاب کی زد میں آکر یہاں کی آبادی کا کثیر حصہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پھر یہ تباہ حال لوگ روٹی، غذا اور سر چھپانے کے لیے انتہائی بے بسی لاچاری کا شکار نظر آتے ہیں۔ ہمارے سیاست دان، حکمران اس سیلابی صورتحال کا صدباب اور آئندہ کی مناسب منصوبہ بندی کے بجائے عوام کو صبر اور برداشت کا مشورہ دیتے پائے جاتے ہیں۔ عوام برباد ہو جائے، لقمے لقمے کو ترسے، چاہے سیلاب ان کی بستیوں کی بستیاں بہالے جائے یا ان کے بچے اور مال مویشی تیز لہروں کا شکار ہو کر اپنی جان ہار جائیں مگر سیاستدانوں کو اقتدار کی ہوس اور کرسی کرسی کے کھیل سے فرصت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص از راہ ہمدردی عوام الناس کی خستہ حالی، تکالیف کی جانب ان اقتدار پرست سیاست دانوں کی توجہ مبذول کروائے یا ان کی امداد کے لیے ان سے بات چیت کرے تو جواباً سنگ دلی اور ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ یہ سیلاب کے ہاتھوں تباہ ہو کر ترستی، بلکتی، تڑپتی اور در در بھٹکتی عوام اس خطے کے باشندے ہی نہیں اور نہ ہی ان کی دستگیری کرنا ان سیاست دانوں کا قومی و اخلاقی فریضہ ہے۔ بلکہ اس طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ جیسے یہ عوام ایسے علاقوں میں رہتی کیوں ہے کہ جہاں سیلاب آتے ہیں۔ وہ اپنی نامناسب منصوبہ بندی اور انتظامی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے انتہائی بے شرمی سے عوام کو ہی موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے افسانہ کی ایک طاقت ور مذاحمتی آواز علی تنہا نے اپنے افسانوں میں اس خطے کی عوام کے حقوق کے لیے مسلسل آواز بلند کی۔ ان کے افسانہ ''دھوپ کے سب لوگ'' سے اقتباس ملاحظہ کیجیے :

> ''اب دونوں کے پیلے پڑتے چہروں پر گھبراہٹ کی تہہ جم گئی تھی۔ لوگوں کے آسمان ڈھاتے شور میں صالح عثمان نے ہمت کر کے وارث کو جھٹکا دیا ''میاں! یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پانی شاید اوپر اٹھ آئے نشیب کے اس علاقے سے نکل بھاگیں تو اچھا ہے۔ '' وہ بے حس و حرکت ٹکر ٹکر پانی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ '' پانی ہمیشہ ترائی کے علاقے میں لوگوں پر عذاب اتارتا ہے۔ یہ لوگ اتنی گہرائی میں مکان کیوں بناتے ہیں؟'' وارث نے بل ڈاگ کی طرف غرا کر صالح عثمان کو گھورا۔ ''زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اب واپس، بہت تماشا ہو لیا۔ زہرہ سے بھی جان چھوٹ

جائے گی"۔۔۔ تمہارے دل میں خوف خدا کا ذرہ بھی نہیں ہے۔ زہرہ مر جائے، خلقت مر جائے، تمہیں کیا اس سے؟ لوگ سچ کہتے ہیں تمہارے بارے میں۔" واہ لوگوں کے خیر خواہ! تم پر بھی اس امیر الدین کا اثر ہونے لگ گیا۔ اپنے تا چھلے کی فکر کرو۔" 24

یہاں غریبوں کی زندگی انتہائی کٹھن ہوتی ہے۔ بنیادی اور معاشی مسائل اتنے ہیں کہ چین کی سانس نہیں لینے دیتے۔ دن رات کی تگ و دو کرنے کے بعد بمشکل اپنے بچوں کا پیٹ بھر پاتے ہیں۔ اپنے بچوں کی فاقہ کشی ہر آن لرزہ براندام رکھتی ہے۔ غریب کے پاس فقط عزت کا آبگینہ ہوتا ہے جسے وہ سینت سینت کر رکھتا ہے غریب شخص اپنے گھر کی بیٹی میلی آنکھوں سے پوری طرح بچانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ کوئی ظالم درندہ اس کی عزت و آبرو سے کھلواڑ نہ کر سکے۔ بیٹی چاہے کسی کی ہو لائق احترام ہوتی ہے۔ یہی درس سیرت رسول ﷺ سے ملتا ہے۔ جو کسی کی بہو بیٹی کی عزت نہیں کر سکتا اسے اپنی عزت کا بھی خیال نہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اس خطے کے طاقتور سیاستدانوں اور جاگیر دار طبقے کا من پسند مشغلہ ہے۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کہیں بے کس غریب کی بے بس آبرو مند بیٹی دکھائی دے تو اسے اپنی درندگی کا نشانہ بنائیں۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے غریب بے بسی کی تصویر بنا رہے گا اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اس گھناؤنے کھیل سے اس غریب اور لاچار بیٹی پر کیا گزرے گی۔ آئے روز اخبارات میں غریبوں کی جاگیر داروں یا سیاست دانوں کے ہاتھوں لٹتی عزتوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ مگر انصاف کسی کو نہیں ملتا۔ بڑے بڑے دعوے تو کیے جاتے ہیں مگر عملی تعبیر نہیں ہوتی۔ جتنے واقعات میڈیا کی زینت بنتے ہیں ان سے کہیں زیادہ تعداد ان واقعات کی ہوتی ہے جو گم نامی کے ٹیلوں میں دب جاتے ہیں۔ بدنامی کے خوف یا سماجی دباؤ کی وجہ سے غریبوں کی عزت کی پامالی کے زیادہ تر واقعات منظر عام پر نہیں آتے۔ اگر منظر عام پر آ بھی جائیں تو ملزمان کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی۔ ناقص تفتیش کی بنا پر بھاری بھرکم رشوت کے سبب پولیس تفتیش میں سقم ڈال دیتی ہے، جس کی وجہ سے غریب مظلوم کی داد رسی نہیں ہوتی۔ جاگیر دار طبقہ اپنے دھن دولت کی وجہ سے غریب کا منہ بند کر دیتا ہے۔ جاگیر دار طبقہ سماج میں موجود غریب خواتین کے لیے ظالم بھیڑیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی درندگی کا شکار اکثر خواتین یا تو خودکشی کر جاتی ہیں یا پھر ساری زندگی ذلت کے داغ کے ساتھ بسر کرتی ہیں۔ غریب کی لوٹی ہوئی عزت کا احساس نہیں بلکہ یہ خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مردانگی کا ثبوت دیا ہے۔ راشدہ قاضی نے اپنے افسانہ "امان" میں ظالم جاگیر داروں یا وڈیروں کی چیرہ دستیوں اور غریب گھرانے کی خواتین کی عزت اجاڑنے کے معاملات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ جس میں جاگیر دار کا نو عمر بیٹا ایک غریب خاتون کی بیٹی کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ جب وہ انصاف کے لیے اس جاگیر دار لڑکے کی ماں کے پاس جاتی ہے تو نہ صرف اسے دھتکار دیتی ہے بلکہ اسے کہتی ہے کہ یہ تو جاگیر داروں کے شوق ہیں۔ تیری بیٹی کی عزت لٹ گئی تو کیا ہوا، مرد تو ایسے شوق رکھتے ہیں۔

''ایک دیہاتی عورت روتی ہوئی آئی۔ بڑی ملکانی نے چلغوزے سائیڈ پہ کر دیئے۔ اور پوری طرح متوجہ ہوگئی۔ عورت نے ہاتھ باندھ دیئے اور روتے ہوئے کہا! کہ میری معصوم بچی کی عزت پہ ملک شرجیل نے ہاتھ ڈالا ہے تو۔۔۔؟ ملکانی کا جلال دیدنی تھا۔ وہ عورت زار و قطار رونے لگی۔ اس نے بڑی ملکانی کے پاؤں پکڑے تو ملکانی نے پاؤں جھٹک کے اسے پرے پھینک دیا۔ وہ عورت پھر آگے بڑھی اور جھولی پھیلا کر انصاف مانگا۔ ملکانی کھڑی ہوگئیں اور غصے سے پھنکارتے ہوئے بولیں۔ تم ہمارا مال ہو۔ ہم جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ تھوڑی دیر بعد مسکرا کر خود کلامی کی ''تو ملک شرجیل جوان ہوگیا۔'' اور پھر بڑے فخر سے بولیں۔ ملکوں کا نر بچہ ہے۔ مجھے اس میں اور سدو میں کوئی فرق نہ لگا۔ مجھے پریشان دیکھ کر بولیں! کہ چھوٹی ملکانی آپ ابھی تک ملکوں کو نہیں سمجھیں؟ میں چپ رہی تو ملکانی نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اور بولیں! جاگیرداروں کے اپنے ہی مزاج ہوتے ہیں اور اپنے قاعدے قانون!۔''25

جنوبی پنجاب کے اردو افسانہ نگاروں میں راشدہ قاضی مزاحمتی ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ جنوبی پنجاب کے قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس معاشرے کے نظام پر نوحہ کناں ہیں۔ ڈاکٹر نجیب حیدر ملغانی لکھتے ہیں:

''راشدہ کی داخلی تخلیقی توانائی انسانی رشتوں کی پاکیزگی اور ان سے وابستہ ماورائی تصور کی بجائے ان الجھنوں کو اپنا محور بناتی ہے جن کا اظہار کسی حبس زدہ معاشرے میں بغاوت اور فحاشی کے زمرے میں آتا ہے۔''26

وسائل کی غیر متوازن تقسیم اور ارباب اختیار کے وسائل پر غاصبانہ قبضے سے مسائل کا ایک ہی فریق منہ کھولے کھڑا ہے، جو غربت اور پس ماندگی کا شکار افراد معاشرہ کو نگلنے کو بے تاب ہے۔ اس غربت و افلاس کے بہت سے اسباب ہیں۔ جن میں سب سے بڑا سبب سیاسی اشرافیہ کا وسائل کا رخ اپنی طرف موڑنا ہے۔ یہ ظلم اور اندھیروں کے پروردہ سیاسی مگرمچھ ہر ایک چیز کو اپنے دندان آز میں دبوچ کر اپنے شکم بیکراں میں اتار لیتے ہیں۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ان کے پیٹ کا حریص کنواں پر ہونے میں نہیں آرہا۔ خزانہ اور وسائل لوٹ لوٹ کر اپنے لیے دولت کے پہاڑ کھڑے کر رہے ہیں۔ جنوبی پنجاب کی عوام کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اس خطے کی عوام کی بڑی تعداد خط غربت سے کہیں نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، بھوکے پیٹ، بلکتے بچے قطرہ شیر کو ترستے ہیں۔ ماں باپ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے تکتے ہیں کہ شاید کہیں امید کی کرن دکھائی دے۔ مگر چاروں طرف سے مایوسی و مصیبت کے اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آنکھیں اندھیرے میں بھٹک بھٹک کر تھک جاتی ہیں۔ انہیں اپنی بے بسی

پر رونا آتا ہے۔ سیاست کے پنڈت اپنی ہوس اور دولت کی لالچ میں اندھے ہوتے ہیں۔ ان کا اندھا پن ایسا ہے کہ یہاں کی عوام کی بے کسی اور ذلت بھری زندگی انہیں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ ہر طرف سے اندھوں کی طرح آنکھیں بند کر کے ملک و قوم کے وجود کو جونک کی طرح لپٹ کر خون پیے جا رہے ہیں۔ انوار احمد نے اس خطے کے سیاست دانوں کے ظالمانہ، غاصبانہ رویوں اور عوام کی بے بسی کو طشت از بام کرتے ہوئے اپنے افسانہ " بچھوں کے ساتھ رات " میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے :

> "میں نہیں ڈرتا ہوں رات کے شر سے مگر اس شر کی پیپ پر پلنے والے عفریتوں سے، ان عفریتوں سے جن کا ہونا یقین بھی ہے اور وسوسہ بھی، پھر میں ڈرتا ہوں وسوسے سے جو جنم لیتا ہے اندھیرے سے اور جنم دیتا ہے اندھیرے کو۔۔۔" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولا "میں نے جب اس آنکھ کھولی ہے، گھر میں اندھیرا ہی دیکھا ہے، سنا ہے، میری پیدائش پر میرے باپ نے ہمسائے سے چراغ مستعار لے کر مجھے دیکھا تھا، اور پھر اندھیرے ہی میں نوافل ادا کیے تھے۔۔۔ اس اندھیرے میں میں نے رشتے گم کیے اور رشتے پہچانے، اس اندھیرے میں جس میں کان جاگتے ہیں۔ میں نے ماں کو لوری سے اور باپ کو ہنکارے بھرتی خاموشی سے جانا، البتہ بچھوؤں کو اپنا بدن نیلا کر کے ہی پہچانا۔۔۔"27

انوار احمد جنوبی پنجاب کے نامور اردو افسانہ نگار ہیں۔ ان کی سوچ، فکر اور اپنے خطے پر ہر طرح سے نظر اور وسائل کو اجاگر کرنے کے بارے شوکت نعیم قادری لکھتے ہیں:

> "انوار احمد کے یہاں غربت، خوف، یاس، نفرت، منافقت، پابندی افکار و اظہار وغیرہ جیسے جذبے Shoking Treatment کے طور پر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں Shoking End نہیں ہوتا بلکہ ان کے تیکھے جملے، کہانی کی کشمکش اور کردار جب چونکتا ہے تو سوچتا ہے اور جب سوچتا ہے تو مسائل کا کوئی نہ کوئی حل سامنے آ ہی جاتا ہے یہی انوار احمد کا مدعا اور منشا ہے۔"28

سیاست کا اصل فریضہ تو یہ ہے کہ ایک پر سکون اور پر امن معاشرہ تشکیل دیا جائے۔ جہاں انسانوں کو کسی قسم کی تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر فی زمانہ سیاست اور سیاستدان اپنے اصل خطوط سے ہٹ گئے ہیں۔ آج سیاست اقتدار سے چمٹے رہنے اور زیادہ سے زیادہ ملک کو نوچنے گھسوٹنے کا نام ہے۔ اگر عوام الناس ان کے پاس اپنے ذاتی مسائل کے

حل کی غرض سے جاتے بھی ہیں تو شنوائی نہیں ہوتی یا کوئی عوامی آدمی اپنے حقوق مانگنے کی جرات بھی کرتا ہے تو مختلف الزامات کے تحت اس کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ یہ سیاست دان اپنی ترجیحات اور حصول مقصد کے لیے سفاکیت کی ہر انتہا سے گزر جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے مظالم کے شکار لوگ ان کے خلاف کھڑا ہونے یا احتجاج کی سکت تک نہیں رکھتے۔ انوار احمد اپنے افسانہ ''گرجھوں والی سرکار کی دعا'' میں ایک کردار ''سائیں جی'' کی شکل میں سیاست کے بڑے پنڈت کو سائیں جی کے روپ میں پیش کرتے ہیں کہ جس کے پاس استحصالی نظام کے شکار مظلوم دعا کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں اور اپنے اوپر بیتنے والے مظالم کی کتھا اس کے گوش گوار کرتے ہیں، بجائے ان کی غم گساری، اشک شوئی کے یا غصب شدہ حقوق کی فراہمی کے جنوبی پنجاب کے یہ بے رحم سیاست دان عوام کو صبر کا مشورہ دیتے ہیں۔ انہیں کہتے ہیں کہ صبر کریں، صبر کے علاوہ اور کیا، کیا جا سکتا ہے۔ جیسے سائیں جی کے پاس آنے والی ایک مظلوم خاتون اپنے اوپر بیتنے والی مصیبت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی دکھ بھری کہانی سائیں جی کے سامنے بیان کرتی ہے کہ کچھ لوگ اس کے بیٹے کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ کیوں کہ اس کا بیٹا ماں کا بڑا خدمت گار ہے۔ جو بھی بیٹا ماں کا خدمت گار ہوتا ہے یہ لوگ اسے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ یہاں پر خدمت گار بیٹے سے مراد وطن کا فرض شناس طبقہ ہے۔ جو دھرتی ماں کی ترقی و خوشحالی کے لیے ہر پہلو سے کوشش کرتا ہے۔ بد عنوان سیاست دان کبھی کبھی دھرتی کے ایسے سپوتوں کو برداشت نہیں کرتے جو ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں:

> ''میں، ماں، ہاں پر جس پتر سے میری بنی ہو یا وہ میری خدمت کرنے جوگا تو وہ اس کو پکڑ کر لے جاتے ہیں، میں منت وزاری کروں تو کہتے ہیں کہ کودن رن یہ تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ ورنہ یہ پتر بھورے تو تیرا سودا کیے بیٹھے ہیں۔'' میں ہتھ جوڑ کے کہتی ہوں۔ ''کوئی ماں سے بھی تو پچھے جو کون کملا اس کی عزت تے آبرو کا پہرے دار ہے اور کون چندر اسوداگیر۔ ماں او تری کی کوئی سنتا ہی نہیں، بک بک روتی اس لیے ہوں کہ جنہوں کو وہ مجھ سے چھین لے جاتے ہیں میرا دل انہی کے لیے کرلاتا ہے، او سائیں گرجھوں والی سرکار! اس سے پہلے کہ میرا یہ ادھا سر بھی ننگا بچا ہو جائے، اس وستی کوں برباد چا کر جو ظلم تے قہر کے برباد ہونے کا بیا راستہ نظر نہیں آتا۔'' 29

جنوبی پنجاب کے مفلوک الحال اور پسماندہ طبقات کا کوئی پرسان، حال نہیں۔ ان کو بنیادی انسانی حقوق فراہم نہیں کیے جاتے اور نہ ہی ان کو کچھ خاص فلاحی منصوبے دیے گئے ہیں۔ جنوبی پنجاب ہر زاویے سے انحطاط کا نمونہ نظر آتا ہے ۔ سیاست دان بیوروکریسی اور دیگر بنیادی حقوق مہیا کرنے والے ادارے جنوبی پنجاب سے آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔ یہاں کی عوام کو ملک کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ اگر ان کو اس ملک کے باشندے سمجھا جاتا تو ان کی فلاح و ترقی کے لیے غور

کیا جاتا۔ ان کو بھی بنیادی انسانی حقوق میسر ہوتے۔ مگر یہ خطہ ہمیشہ استحصال کی زد میں رہا ہے۔ اس کے باشندے ہمیشہ بد قسمت رہے ہیں۔ یہاں کے سیاسی لوگ یا سیاست دان جنوبی پنجاب کے عوام کے مسیحا بننے کی بجائے کبھی تخت لاہور کے غلام بنے تو کبھی تخت لاڑکانہ۔ ان کا اپنا کوئی تشخص نہیں نہ ہی ان کی کوئی ذاتی اہمیت ہے۔ ان کو عوام کے مسائل حل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ب: آزادی اظہار رائے! مذاحمتی عناصر کا مطالعہ

جب سے انسان نے باہمی ربط اور افہام و تفہیم کے لیے الفاظ کا استعمال سیکھا تب سے مافی الضمیر کا اظہار اس کی بنیادی ضرورت بن گیا۔ کیوں کہ جب تک جذبات و احساسات کو آزادی اظہار رائے نہیں ملے گی تب تک اپنی پسند و ناپسند کے معاملات نہیں چلا سکے گا۔ مہذب معاشرے میں جذبات و احساسات کا اظہار ہاتھ پاؤں کی حرکات سے نہیں بلکہ شائستہ الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانوں کو مختلف قسم کے انفرادی و اجتمائی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ حالات کبھی غم و اندوہ کی گہرائیوں میں ڈبو دیتے ہیں۔ کبھی ان حالات کی وجہ سے اسے سکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی غم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ آزادی اظہار رائے کے لیے درج ذیل تعاریف ملاحظہ کریں۔

> "Freedom of expression gives one the right to express opinion freely, with no restriction. " (30)

برٹرینڈ رسل کے مطابق :

> ” ہمارے خیالات کی آزادی سے فن اور فلسفے کی پوری دنیا ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ حسن کا وژن بھی جنم لیتا ہے۔“31

موجودہ دور اپنی ترقی اور ایجادات کی بناپر تاریخ کے ہر دور سے زیادہ روشن و عظمت کا دور ہے۔ عقل انسانی نے ایسے کارنامے سر انجام دیے کہ دنیا ایک گلوبل ولیج کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہ کیفیت جہاں انسانوں کی ترقی اور اس کی رفعت پر دلالت کرتی ہے وہاں پر انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین اقوامی سطح پر نازیبہ رویے بھی عیاں کرتی ہے جس میں سر فہرست عالمی طاقتوں کا نیو ورلڈ آرڈر ہے۔ جس کی بناپر دنیا کے پسماندہ ممالک، عالمی طاقتور ترین ممالک کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ آزادی اظہار پر قدغن کا معاملہ صرف بین الاقوامی سطع پر نہیں بلکہ معاشرے کے ہر سطع کے دائرہ کار یہ طاقتور، کمزور کے منہ پر مہرہ لگاتا آیا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ طاقتور طبقہ آزادی اظہار رائے پے نہ صرف قدغن لگاتا آیا ہے بلکہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والے لوگوں کی جان تک لے لیتا ہے۔ دوسری طرف جہاں آزادی اظہار کا حق ہر ایک انسان کو حاصل ہے وہاں پر آزادی اظہار رائے کی آڑ میں بڑے بڑے گھناؤنے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔

خاص طور پر عالمی سطح پر اظہار رائے کی آزادی کو آڑ بنا کر مقتدر شخصیات پر رکیق حملے کیے جاتے ہیں اور اس کو آزادی اظہار کا نام دیا جاتا ہے جو کہ نازیبا طرز عمل ہے۔ اظہار رائے کی آزادی یا تو اپنے استحقاق کے حصول کے لیے ہے یا پھر اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ مقتدر شخصیات پر بے ہودہ الفاظ کا نشانہ بنانا قطعی طور پر اظہار رائے کی آزادی نہیں۔ آزادی اظہار رائے کا حق ہمیشہ معتدل انداز میں استعمال کیا جائے۔ جنوبی پنجاب کے اردو افسانوی ادب میں آزادی اظہار پر مسلط جابرانہ طرز عمل کے خلاف بھرپور مزاحمت پائی جاتی ہے۔ جنوبی پنجاب کے افسانہ نگاروں نے اپنے خطے کی عوام کے حقوق کے لیے کھل کر مزاحمت کی اور اس خطے کو سیاسی ڈکٹیٹروں کے جابرانہ رویوں کو کھول کھول کر بیان کیا۔ یہاں کے ظالم سیاست دانوں کی اظہار رائے کی آزادی پر لگائی گئی پابندیوں کو خوب واضح کیا۔ جنوبی پنجاب میں زیادہ تر سیاست دان جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی ذہنیت کے مطابق آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی علاقائی عوام یہاں کی عوام ان کے غلام کی سی حیثیت رکھتی ہے، جن کے کچھ بنیادی یا معاشرتی حقوق نہیں ہیں۔ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے۔ راشدہ قاضی نے بے سہارا اکیلی بھٹکتی لڑکی کے علامتی استعارے میں جنوبی پنجاب کے عوام پر مسلط استحصالی رویے کو عیاں کیا۔ جس میں انہوں نے اس بے سہارا لڑکی کو دلہن کے روپ میں پیش کر کے دلہن کا روپ لوٹ لینے کو یہاں سیاست دانوں کے بھیانک رویوں کا نشانہ بن کر روکھی پھیکی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونے کو ظاہر کیا ہے۔ پھر یہ دلہن زندگی بھر شوہر کے قیدی کی حیثیت سے دن رات خدمت گزاری کرنے کے باوجود پاؤں کی ٹھوکروں میں رہتی ہے اور ہر قسم کے طنز و ملامت کا ہدف بھی بنتی ہے۔ یعنی یہ جنوبی پنجاب کے عوام کا حال اس اجڑی ہوئی قیدیوں جیسی رنج و غم سے معمور زندگی بسر کرنے والی دلہن جیسا ہے۔ جن پر یہاں کے مسلط سیاست دانوں نے نہ صرف ان کے بنیادی حقوق غصب کیے ہیں بلکہ ان کو آزادی اظہار رائے کا حق بھی نہیں دیا:

> ''زندگی میں نے عمر قید کی طرح کاٹی۔ سایہ بھی چلتا رہا۔ کبھی حوصلہ نہ دیا قیدیوں کی عمر قید رات دن شمار ہوئی ہے۔ میری عمر قید تو ڈبل ہوگئی۔ وہ بھی بامشقت ۔۔۔ جس میں گالیاں، الزام گھریلو کام اور آدھی رات تک جیلر کے پاؤں دبانا بھی شامل تھا۔''32

کمزور اور مفلوک الحال عوام کا استحصال آج کے مطلق العنان، عوام کو اپنے غلام کی نظر سے دیکھنے والے جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں کا پسندیدہ طرز عمل ہے۔ یہ جبر کے رسیا سیاست دان ہمیشہ سے اپنے سامنے یا اپنے خلاف کسی کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتے۔ اگر کسی کے دل میں حصول حقوق کا خیال بھی آجائے تو اس کو اپنے جبر ناروا کے ذریعے کچل ڈالنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ ان سیاست دانوں نے یہاں کی عوام پہ اپنے ظلم کی تاریکی پھیلا رکھی ہے۔ کوئی بھی اس تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر آتا ہے۔ تو ان کے جبر کی تاریکی انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اپنی

تاریک بھول بھلائیوں میں گم کر دیتی ہے۔ان مطلق العنان سیاست دانوں، حکمرانوں کا جابرانہ رویہ ملک کے کتنے ہی روشنی کے طلب گاروں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ نوبت تو یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب حق کے حصول کے لیے اور حق کی راہ پر چلنے سے ڈر لگتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی حق سچ کی بلندی کے لیے آواز اٹھانے کی کوشش بھی کرے تو دوسرے روکتے ہیں۔ کیوں کہ انہیں روشنی کے طلب گاروں کا انجام معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کا انجام بھی پہلے لوگوں کی طرح بھیانک ہو، یہ بھی ہمیشہ کے لیے اندھیروں کے قیدی بن کر رہ جائیں۔ جاوید اختر بھٹی اپنے افسانہ ''سورج راج'' میں جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں کے اسی تاریک اور بھیانک رویے کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے غریب عوام کے حقوق کی آواز بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ میں یہ عوام کو بوڑھی ماں کے روپ میں پیش کر کے مزاحمت کاروں کو مزاحمت کی راہ سے روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ ان کی مزاحمت کا ایک خوب صورت انداز ہے۔ وہ اس میں ان سنگ دل اور سفاک سیاست دانوں کے قاہرانہ رویے کو ہدف ملامت بناتے ہوئے ان کے منفی طرز عمل کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں :

> ''ماں نے کہا'' میرے بیٹے تو تاریکی سے نہیں لڑ سکے گا۔ وہ ظالم ہے۔ بہت مکار ہے۔ وہ میرے بیٹے کھا چکی ہے۔ میرے پیارے بیٹے تو بہادر ہے۔ بہت بہادر ہے۔ مگر تنہا بھی تو ہے۔ باقی بیٹوں کی طرح رات ہوتے ہی گھر میں چھپ جایا کر ____ میرے بیٹے اوروں کی طرح روشنی اور تاریکی کے چہرے دیکھتا رہ۔۔۔ تاریکی نے اسے قید میں ڈال دیا۔ وہ اب بھی وہاں قید ہے۔ مگر زندہ ہے اسے ماں کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ وہ تاریکی سے خوفزدہ نہیں۔ وہ دھرتی کے بہت سے بیٹوں کی آوازیں ایک ساتھ سن رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ ''ماں ہم سورج راج چاہتے ہیں۔'' 33

سوچوں کو پابند سلاسل کرنا سیاست کے خداؤں کی اولین ترجیح رہی ہے۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ بدن کو زنجیروں میں مقید کیا جا سکتا ہے لیکن خیالات کی پرواز قفس میں بند نہیں کی جا سکتی۔ جب تک انسان زندہ ہے تو اس کے خیالات زندہ ہیں تو سوچوں کی پرواز بھی جاری رہے گی۔ سقراط سے لے کر آج تک تاریخ کے ہر دور میں حق اور سچ کا علم بلند کرنے والے ہمیشہ میدان عمل میں رہے ہیں۔ کبھی نوحؑ کے روپ میں، کبھی نمرود کے سامنے ابراہیمؑ کی شکل میں اور کبھی فرعون کے سامنے موسیٰؑ کی صورت میں حق گو لوگ روئے زمین پر اپنے وجود کا پتہ دیتے رہے۔ آزادی اور حق گوئی پر قدغنیں لگانے والے لوگ یہ بات بھول بیٹھے کہ کبھی کسی کے خیالات کو بھی قید کیا جا سکتا ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ سچ کو جتنا دبانے کی کوشش کروگے وہ اتنا ہی قوت سے واضح ہو کر سامنے آئے گا۔ جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں نے بھی ہمیشہ آزادی اور حق گوئی کا استیصال کیا۔ یہاں پر کبھی کسی نے ان کے کرتوتوں کو سامنے لانے کی جرات بھی کی تو وہ

زیر عتاب آیا۔ اس کا تعلق چاہے الیکٹرانک میڈیا سے ہو یا پرنٹ میڈیا سے۔ خواہ اس کا تعلق سوشل میڈیا سے ہی کیوں نہ ہو، جس نے بھی ان کے خلاف کھڑا ہونے کی جرات کی اس کو راتوں رات صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا یا پھر اس پر عرصہ حیات اس طرح تنگ کر دیا گیا۔ وہ جئے تو کیا موت کے لیے بھی ترسے۔ اگر کسی نے بھولے سے بھی کسی طاقت ور سیاست دان کے خلاف اپنے اخبار یا چینل پر کوئی بات کہہ دی تو اخبار کی ضمانت ضبط کر لی جاتی ہے یا چینل کی نشریات ہی سرے سے بند کر دی جاتی ہیں۔ اگر صحافی ہے تو اس کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے ہیں۔ اکثر اخبارات و چینل کے مالکان مختلف سیاسی گاڈ فادرز کے زیر سایہ ہوتے ہیں اور ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی حق گو صحافی ان طاقت ور سیاست دانوں کا اصل چہرہ عوام کے سامنے عیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو متعلقہ سیاست دان کو ایک ہی تنبیہ حکم نامہ اس بے چارے کے لیے زندگی کا سب سے بڑا عذاب ثابت ہوتا ہے۔ اکثر اخبارات یا چینلز کے مالکان ان سیاست دانوں کی آشیر باد حاصل کرنے کے لیے رد عمل کے طور پر فوری حرکت میں آجاتے ہیں۔ ایسے جرات مند صحافیوں کو نکال باہر کرتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تمہاری جرات کیسے ہوئی ہے کہ ہمارے سیاسی ان داتا کے خلاف بولو۔ اخبارات، ٹی وی چینلز کی تنظیمیں ایسے آدمی کے خلاف محاذ بنا لیتی ہیں اور کوئی بھی اسے ملازمت پر رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کی نگاہوں میں اس کا گناہ نا قابل معافی ہوتا ہے۔ جسے کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یوں وہ مزاحمت کار زندگی کی تلخیاں سہنے پر مجبور ہو جاتا ہے تا وقتیکہ اس کا جرم مذکورہ سیاست دان معاف نہ کرے۔ اگر معافی مل گئی تو پھر آپ آئندہ کے لیے احتیاط کریں کہ کبھی بھی اس طرح کے الفاظ زبان نہ نکالیں جن سے زندگی کی راہوں میں سوائے تکلیف کے کچھ نہیں ملتا۔ جب تک قوموں کا شعور زندہ نہیں ہوتا اس وقت تک ان سے جانوروں جیسا برتاؤ جاری رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جانوروں کو ہانکا جائے، جیسا اور جتنا دیا جائے۔ چاہے اس پر ڈنڈے برسائے جائیں یا جب دل کرے ان کی گردن پر چھری پھیر دی جائے۔ ایسے ہی جنوبی پنجاب کی عوام ایسے جبر کو سہنے پر مجبور ہے۔ علی تنہا نے اپنے افسانہ ''انصاف کا سر'' میں اقوال کا علامتی استعارہ لے کر جنوبی پنجاب کے حق گو اور حق پرست لوگوں کا انجام واضح کرنے کی کوشش کی۔

> ''تم پاگل کب سے ہو گئے؟ یہ قوالی میں طنز اور کنایہ؟ یہ کس حرام زادے سے سیکھ آئے؟ تمہیں معلوم ہے، میرے ساتھ، مجلس میں کون تھا؟ ہے کچھ پتہ تمہیں، اب کے میں نے گرفتاری سے بچا لیا۔۔۔۔ سر جھکائے، مردہ حالت میں دلبر مستانہ قدم اٹھانے لگا تو، شاہ دلگیر، کی بھاری آواز سے کمرہ گونجا۔ ''اور سن لو، اس کے بعد سب آستانوں اور درگاہوں کے دروازے تم پر بند ہوئے، جاؤ، نکلو جلدی سے۔''''34

جمہوریت اس خطے میں صرف نام کی ہے، اس خطے میں حکومت سرداروں، پیروں اور جاگیرداروں کی ہے۔ ان لوگوں نے عوام کو اس قدر دباؤ میں میں رکھا ہوا ہے کہ کوئی ان کے خلاف یا معاشرے میں ہونے والے مظالم و زیادتوں کے بارے اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ جب کہ اظہار رائے کی آزادی تو جمہوریت کا حسن ہے۔ اس بارے رچرڈ مون لکھتا ہے:

> "آزادی اظہار کا انحصار معاشرتی معاملات پر منحصر ہے کسی فرد سے مکالمہ و گفتگو تعلقات اور ایسوسی ایشن کی تشکیل کرتا ہے جیسے کنبہ، دوست احباب، ساتھ کام کرنے والے ملک کے شہری۔ دوسروں سے بحث و مکالمہ کے ذریعے ایک فرد نہ صرف خود کے علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ پورے سماج کو صحیح سمت دیتا ہے۔ "35

فی زمانہ تعلیمی تناسب کے لحاظ سے تاریخ انسانی کے ہر دور سے بلند ترین سطح پر ہے۔ معاشرے میں شرح خواندگی بڑھ گئی مگر جرائم کا تناسب بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا۔ پڑھے لکھے لوگ ہی معاشرتی اصول وضوابط کی اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیوروکریسی، سیاست دان تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مختلف جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے جرائم /گناہوں کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ مطلق العنان حکمران رعایا کو اپنی پوجا پاٹ پر لگا دیتے اور اس پہ اس قدر ظلم و ستم ڈھاتے کہ وہ ان حکمرانوں کو اپنا خدا سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے خلاف ہونے والی ہر سوچ کا گلا گھونٹ ڈالا۔ موجودہ دور میں بھی جنوبی پنجاب کے اکثر سیاست دانوں نے یہاں کی عوام کو دہشت و خوف کے ہتھیاروں سے ہراساں کر کے انہیں اپنا بندہ بے دام بنا رکھا ہے۔ سیاست دانوں نے مختلف ہتھکنڈے اپنا کر ان لوگوں کو شدید خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کسی میں مزاحمت واحتجاج کی روح جاگتی بھی ہے تو اس کا ایسا حشر کیا جاتا ہے کہ پھر وہ اس بارے میں سوچنے سے بھی خوف زدہ رہتا ہے۔ اس خطے کے سیاست دانوں نے قوت فکر اور طاقت گفتار رکھنے والے افراد کو بھی ناجائز مقدمات میں پھنسا کر تو کبھی عوامی سطح پر لڑائی جھگڑوں میں الجھا کر اور کبھی اپنے پالے ہوئے غنڈوں کے ذریعے اس راہ سے ہٹوا دیا تاکہ کوئی ان کے جرائم کو دنیا کے سامنے لانے والا نہ ہو۔ جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں نے یہاں کی عوام پر اپنے ظلم و جبر کی گھٹا ٹوپ تاریکی مسلط کر رکھی ہے۔ یہاں کے مجبور عوام نسل در نسل مظالم کے ان اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ نسل در نسل کی غلامی نے ان سے ناہموار معاشرتی رویوں کے خلاف آواز اور قوت فکر چھین لی ہے :

> "اسے بڑا رنج ہوا، جب اس نے دیکھا کہ ہر صاحب کمال اپنی باری آنے پر ایک ہی لطیفہ سنا دیتا ہے اور ہر مرتبہ اس لطیفے پر سارے لوگ کھل کھلا اٹھتے، ہنستے ہنستے بے دم ہوتے دکھائی دیتے اور پھر جیبوں سے سرکاری رومال نکال کر آنکھوں کے کونے صاف کرنے لگتے۔ وہ کچھ دیر اس منظر کو دیکھ کر اداس بیٹھا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسی اندھی رات چپکے سے اس کے شہر پر سے گزر جاتی۔ اس لمحے اس پر گالیوں، مکوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے چند کڑکتی آوازیں سنیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس حرام زادے کو سوچتے دیکھا ہے۔"36

خطۂ جنوب میں سیاست نہیں بلکہ سیاسی اجارہ داری کا راج ہے۔ یہ جبر اور استحصال کے نمائندے سیاست دان اپنے بھرپور جابرانہ اور انتقامی رویوں کے ساتھ دندناتے پھرتے ہیں۔ جگہ جگہ ان سیاسی گاڈ فادروں کے ٹاؤٹ، پتھارے دار اور پالتو غنڈے موجود ہیں۔ جن کا کام ان سیاستدانوں کی دھاک بٹھائے رکھنا اور ان کی سیاسی اجارہ داری کو دوام بخشنا ہے اگر کوئی آزادی رائے اظہار کو لینا بنیادی حق سمجھتے ہوئے کبھی ان سیاسی ٹھیکداروں کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرات بھی کرے تو وہ بیچارہ دن کے اجالے میں ظلم کی تاریک مسافتوں پے نکل جاتا ہے۔ یہ سماج دشمن سیاست دان اپنے سیاسی مخالفین کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے ناجائز مقدمات اور قانونی داؤ پیچ میں ایسا الجھاتے ہیں کہ وہ سیاست اور الیکشن کے نام سنتے خوف کھاتا ہے۔ کچھ لوگ ان سیاست دانوں کے استعماری پنجے میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ پھڑ پھڑانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ان جبر واستحصال کے مجسموں نے اپنے سیاسی مخالفین کو اس طرح اپنی راہ سے ہٹایا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ ان سیاسی اجارہ داروں کی انتقامی کارگزاریوں کے سبب ان کے کئی مخالفین اور ان کے خلاف آواز بلند کرنے والے زمین میں جا چھپے۔ حفیظ خان نے اپنے افسانہ "جہنم جاگتا ہے" میں ان سیاسی لوگوں کا ظالمانہ طرز عمل اس طرح بیان کیا ہے کہ ان استعماری ذہنیت رکھنے والے سیاست دانوں کا کچا چٹھا اور سامراجی نظام واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ انہوں نے سیاسی لوگوں کی انتقامی کارروائیوں کو اپنے اس افسانے میں جہاں شفاف طریقے سے ظاہر کیا ہے وہاں اس خطے کے وسائل پر قبضہ یا لوٹ مار کو بھی خوب طشت ازبام کیا ہے۔ یہ سیاستدان وسائل پر ناجائز قبضہ کر کے اس خطے کی دولت لوٹ کر کھا جاتے ہیں اور عوام اسی طرح بے بسی کے ساتھ درد بھری زندگی جینے پر مجبور ہوتی ہے۔ عیش و عشرت ان سیاست دانوں کا نصب العین جبکہ غربت، افلاس اور بدنصیبی عوام کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

> "اگر کچھ ہوا تو بس اتنا کہ شکست کا خواب دیکھنے والے خود خواب و خیال ہو کر رہ گئے۔ جنہیں دولت پر مان ہوا، وہ تھانے کچہری میں لٹا، اپنی اوقات میں واپس چلے آئے اور

جنہیں تعلیم پر ناز ہوا، وہ اس طرح مقتول ہو کر قبروں کی خاک میں خاک ہوئے کہ ان کے پیچھے گواہی دینے والا بھی ڈھونڈنے سے نہ ملا۔۔۔ مگر سب کچھ ہڑپ، سب کچھ ہضم۔۔۔رسول پور میں وہی غریبی، وہی اندھیر اسکول موجود تو ٹیچر نہیں۔ سڑک کا نام تو ہے مگر نشان نہیں ہسپتال کا فنڈ تو آیا مگر کاغذوں میں، زمین پر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اگر کچھ واقعی موجود دکھائی دیے تو صرف بیماری، بھوک، بے روزگاری اور جہالت۔۔۔"۔37

جتنی آج وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم پائی جاتی ہے اتنی غیر منصفانہ تقسیم تاریخ میں کبھی نہیں رہی۔ زیادہ تر وسائل اور ضروریات زندگی کی اشیاء پر یہاں کی آبادی کا کثیر حصہ نام نہاد سیاسی اشرافیہ کے غاصبانہ تسلط میں ہے۔ مزدور سارا دن اپنی ہڈیاں نچوڑ نچوڑ کر چند پیسے اپنے خاندان کی گزر بسر کے لیے مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر سخت محنت کے باوجود اس کی کمائی افراد خانہ کی ضروریات پورا کرنے میں قاصر ہے۔ اس بڑھتی ہوئی مہنگائی اور دیگر ضروریات زندگی کی وجہ سے یہاں کی عوام ناگفتہ بہہ حالات کا شکار ہے۔ سیاست دانوں کے گھوڑے سیب کا مربع بطور چارہ استعمال کرتے ہیں جبکہ خطے کے معصوم بچے غذائی قلت اور دودھ کی عدم فراہمی کی وجہ سے آئے روز جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ ایک طرف یہاں کی اشرافیہ کے کتے ہرنوں کا گوشت تناول کرتے ہیں تو دوسری طرف جنوبی پنجاب کی آدھی سے زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ بے حس اہل اقتدار آج عوام کی لاچاری اور مفلوک الحالی سے باخبر ہوتے ہوئے بھی ان کی معاشی حالت سدھارنے اور بنیادی ضروری اشیاء فراہم کرنے میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رکھتے۔ غریب دن بھر کی سخت مشقت کے باوجود جب گھر کو جاتا ہے تو دل میں حساب کرتا جاتا ہے کہ اس گھر کے افراد کے لیے روٹی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ بیمار افراد خانہ کی دوا بھی لینی ہے پھر بھوک سے بلکتے معصوم بچوں کے لیے دودھ کا انتظام بھی کرنا ہے۔ صد ہا افسوس وسائل پر قابض اشرافیہ بھوک سے بلکتے بچوں، فاقہ کشی سے درد کرتے، پیٹوں کو دودھ اور غذا فراہم کرنے کی بجائے اقتدار کے ایوانوں میں اقتدار کی سرمستی میں غرق ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ یہاں کی عوام میں سے کتنے لوگ آج بھوکے پیٹ سوئے، کتنے لوگوں نے بھوک، بے روزگاری اور فاقہ کشی سے تنگ آکر اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا کر خودکشی کرلی۔ جاوید اختر بھٹی نے اپنے افسانہ "تین اینٹیں" میں عوامی بدحالی اور بے بسی کا عورت اور اس کے بچوں کی لاچاری کے علامتی پیرائیہ اظہار میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں نے یہاں کی عوام کو اپنی شاطرانہ، ظالمانہ پالیسیوں، غربت، بے روزگاری اور فاقہ کشی کے ہاتھوں اس قدر ناتواں کر ڈالا ہے کہ عوام میں آزادی اظہار رائے اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی بھی سکت نہیں ہے :

"بیوی اور بچی چیخ چیخ کر احتجاج کریں گیں۔۔۔بیوی روٹی کا مطالبہ کرے گی اور بچی دودھ کا۔۔۔ پھر یہ دیواریں، یہ چھت، فرش بھی نعرہ زن ہوں گے۔ بچی کو ایک پاؤ دودھ دو۔۔۔بیوی کو روٹی دو۔۔۔ مگر اس کی بیوی اور بچی اس کے گھر کی دیواروں کی طرح ۔۔۔ چھت کی طرح۔۔۔فرش کی طرح، کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ جب کسی میں بولنے کی سکت نہ ہو۔ جب کوئی بات نہ کر سکتا ہو۔ انقلاب کیسے لا سکتا ہے، بغیر احتجاج کے انقلاب نہیں آتا۔ احتجاج اس وقت ہوتا ہے جب بدن میں قوت ہو۔۔۔ان کے پیٹ تو اب تک خالی تھے۔"38

بدعنوان عناصر قوم اور پورے خطے کے وجود کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ اس کے وجود کو گوشت کی طرح کتر کتر کھائے جا رہے ہیں اور خون پی رہے ہیں۔ یہ لوگ کبھی ارباب اقتدار کی صورت میں تو کبھی بیورکریسی کی شکل میں دیمک کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ سیاست دان اتنے طاقتور ہیں کہ کوئی شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر کبھی کوئی شخص ان کے خلاف چارہ جوئی کی کوشش بھی کرتا ہے تو اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ ان کے خلاف کھڑا ہونے والے اکثر حریف کی بجائے ان کے حلیف بن جاتے ہیں، یوں وہ سب ایک حمام میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی رشوت یا پیش کش قبول نہ کرے تو پھر اسے زندہ نہیں رہنے دیا جاتا۔ اگر جمہوری اور سیاسی سطح پر ان کے خلاف آواز بلند کی جائے تو وہ بھی مؤثر ثابت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف آواز اٹھانے والے لوگ خود مختلف پریشانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ان کے خلاف کسی قسم کی چارہ جوئی کرنا ان کی اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے یہاں کی عوام میں پروپاگنڈا کے ذریعے اپنا ایسا تاثر قائم کر رکھا ہے کہ لوگ مزاحمت کار کی شدید مزاحمت کے باوجود اس کی طرف ذرا بھر توجہ نہیں دیتے اور یوں اس کی آواز صدا بصحرا کی مثال بن جاتی ہے۔ علی تنہا نے جنوبی پنجاب کو لوٹنے والے ان بدعنوان سیاست دانوں کو سفید چوہے کے علامتی انداز پیش کیا ہے۔ جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ملک و قوم کے خزانے کو کھانے والے یہ سفید چوہے کسی کے قابو میں نہیں آتے۔ اگر کبھی کوئی ان کو پکڑنے کی کوشش کرے تو وہ اسے مروا ڈالتے ہیں۔ یا پھر اسے اپنا ہم پیالہ ہم نوالہ بنا لیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں :

"یہ کام سیاست کے پلیٹ فارم سے آپ کر سکتے ہیں۔ انہیں ختم کرنے کا۔ عدیل نے آہ بھر کر جواب دیا۔ میں نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ عوامی جلسوں میں لوگوں کو جگایا۔ میں نے دیکھا ایک طبقہ میرے خلاف اٹھ کر کھڑا ہوا اور میرے خلاف کیس دائر ہو گئے ۔ ورنہ یہ مہنگائی کے شعلے گھروں کو اپنی لپیٹ میں نہ لیتے۔ ہماری یہاں کسی چیز کی کمی نہیں مگر سب کچھ ہونا ہی نہ ہونا ہے۔"39

اس خطے میں سیاست دانوں نے عوام کی بھلائی اور فلاح کی بجائے ہمیشہ اپنے مفاد کا سوچا۔ عوام بھوک، افلاس اور طرح طرح کے مسائل میں دبے ہوئے ہیں لیکن حکمرانوں کو ذرا بھی خیال نہیں۔

> "اشرافیہ اور مراعات یافتہ دولت مند طبقات کے مفاد بہت ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کا عوامی مسائل کے ساتھ کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ کھاتے پیتے طبقے کے سیاست دان عوام کو صرف "چیریٹی" یعنی خیرات مہیا کر سکتے ہیں۔ ملک کے وسائل کی تقسیم میں ان کو حصہ دار نہیں بنا سکتے۔" 40

آزادی اظہار رائے اور حق گوئی کا استحصال صرف آج کی بات نہیں۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک حق کی آوازوں کو نہ صرف پسِ زندان گم کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ ایسی آوازوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ یہاں کے سیاست دان یا حکمران عوام الناس کا سچ سہنے یا اپنے خلاف کچھ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ جنوبی پنجاب کے سیاسی نظام میں ہمیشہ یہی ہوا کہ ان سیاستدانوں کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا انتہائی بھیانک انجام کیا گیا۔ جسم کے اعضاء کاٹ دیے گئے۔ کانوں میں پگھلا ہو سیسہ ڈالا گیا۔ آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئیں۔ زبانیں کاٹ کر قوت گویائی چھین لی گئی۔ علی تنہا اپنے افسانہ "مخطوطے میں زندہ لوگ" میں جنوبی پنجاب کے ان سفاک سیاست دانوں کے اس خونی کھیل کو علامتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "جناب' وہ کردار سب کے سب ہم خود ہیں۔ جو مصنف اور معزز درباری مارے گئے تھے ہمارا خاندان، ان مقتولین کا قاتل ہے۔ اب آپ سمجھ گئے"۔ صدرالدین' مارے خوف کے اچھل پڑا۔ "کیا کہا؟ قاتلوں کی اولاد ہیں' آپ"۔ "ہاں' اس میں کیا شک ہے۔ مگر' آپ غور کریں کہ جو لوگ' مارے گئے تھے۔ ان کی تعداد' ساٹھ سے زیادہ تھی اور' سنیے' وہ تو مرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔" نوجوان نے صدرالدین کے پریشانی میں ڈوبے چہرے کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ "آپ گھبرا گئے کیا؟ واقعہ یہ ہوا کہ تاج وار نے، مرنے والوں کی پہلے زبانیں کاٹیں پھر آنکھیں نکالیں اور صرف کان رہنے دیے تا کہ وہ فیصلہ کرتے وقت' حکم سن سکیں۔ تو وہ وہی فیصلہ لکھتے تھے، جو انہیں ڈکٹیٹ کرایا جاتا تھا۔" 41

یہاں کے سیاست دان ہمیشہ سے جاگیردارانہ اور جابرانہ طرز عمل کے حامل رہے ہیں۔ عوام الناس کو محض غلام اور حکم کا بندہ سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی۔ جنوبی پنجاب کی عوام نے بھی اسے اپنا مقدر سمجھ کر

خاموشی کالبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اگر کبھی کسی باشعور انسان نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی تو اسے اپنی جان دے کر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس طرح کے مظالم ڈھا کر ان سفاک سیاست دانوں نا صرف اپنی دہشت قائم کر رکھی ہے بلکہ اس طرح کے لوگوں کا انجام دوسروں کے منہ پر بھی تالے لگا دیتا ہے۔

ج: بنیادی جمہوری حقوق! مزاحمت کا تجزیاتی مطالعہ

جمہوریت ایک ایسے طرز حکومت کا نام ہے جس میں عوام کی مرضی اور رائے شامل ہو۔ جہاں پر ملک و قوم کے حق میں لیے جانے والے تمام فیصلے عوام کی امنگوں، امیدوں کے ترجمان ہوں۔ جمہوریت عربی زبان کے لفظ جمہور سے نکلا ہے اردو میں یہ اصطلاح انگریزی کے لفظ 'Democracy' کے توسط سے آئی جو بذات خود یونانی زبان کے لفظ ڈیموکریٹکا سے نکلا ہے۔ Demos یعنی عوام، Kratia یعنی حکومت۔ جمہوریت کی تعاریف ملاحظہ ہوں:

فیروز اللغت اردو کے مطابق :

> "وہ نظام حکومت جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ "42

جہانگیر بدر کے مطابق جمہوریت کی تعریف :

> "ایک ایسا سیاسی نظام جس میں ایک ملک کے عوام اپنی پسند کے کسی بھی طرز حکومت کے تحت نظام حکومت چلاتے ہیں۔ جدید جمہوری حکومتوں میں، زیادہ تر اقتدار اعلیٰ عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے ایک گروہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ان نمائندوں کو عوام ووٹ کے ذریعے مقررہ مدت پوری کرنے سے پہلے بدل بھی سکتے ہیں اور کم از کم اصولی طور پر یہ نمائندے اپنے منتخب کنندگان کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ "43

جمہوریت کا متضاد مطلق العنانی یا آمریت ہے۔ جمہوری دور میں کافی خرابیاں بھی ہیں۔ اس جمہوریت میں طریقہ انتخاب ہی غلط ہے۔ کیوں کہ یہ جمہوری طرز حکومت میں نمائندگان ایوان کا چناؤ انتخابات کے ذریعے عمل میں آتا ہے مگر ان کو منتخب کرنے والے ووٹروں کی اکثریت صائب الرائے نہیں ہوتی نہ ہی ان کا انفرادی و قومی شعور اس سطح کا ہوتا ہے کہ وہ ملی مقاصد کے معاملات کو سمجھ سکیں۔ اکثر و بیشتر عوامی رائے اور ووٹ چند ہزار روپے کے عوض یا قوم قبیلے اور ذاتی تعلقات کی بنا پر دے دیے جاتے ہیں۔ ایسے انتخابات کے ذریعے منتخب ہونے والے نمائندوں کا شعوری مقام قومی معاملات کی سمجھ داری، حب الوطنی اور ان کے شخصی کردار کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ جس کی وجہ سے زیادہ تر

جنوبی پنجاب میں بد عنوان اور نابلد سیاستدان مسلط ہو جاتے ہیں۔ جن سیاست دانوں کی اپنی ذہنی سطح انتہائی محدود ہوتی ہے، قومی اور بین الاقوامی معاملات کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسری خرابی ایک حلقے میں دس افراد بطور انتخابی امیدوار کے حصہ لیتے ہیں۔ اس حلقہ کے عوام کے صرف بیس فی صد ووٹ سے منتخب ہوتے باقی اسی فیصد عوامی رائے باقی نو امیدواروں کے حق میں آتی ہے۔ صرف بیس فی صد عوام کی رائے پانے والا امیدوار فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی مخالفت میں پڑنے والے اسی فیصد ووٹروں کی رائے کا ہرگز خیال نہیں کیا جاتا۔ یہ جمہوریت کی بہت بڑی خرابی ہے۔ عام طور پر جموریت کو عوامی حکومت کا دل کش لیبل لگایا جاتا ہے۔ مگر جتنا عوامی حقوق کا استحصال جمہوری طرز حکومت میں ہوتا ہے اس قدر مطلق العنان حکمرانوں/آمروں کے دور میں بھی نہیں ہوتا۔ عوامی رائے سے منتخب ہونے والے نمائندے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک عوام کے خادم کے طور پر خود کو سامنے لاتا ہے۔ مگر منتخب ہونے کے بعد عوام پر قہر بن کر ٹوٹتا ہے اور ان کے بنیادی جمہوری حقوق ہڑپ کر جاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر سیاسی جماعتیں اور سیاست دان محض نام کے جمہوریت پسند ہیں جو جمہوریت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ ان نام نہاد جمہوری سیاسی لوگوں کے زیادہ تر فیصلے صرف اپنے حق میں ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے ان دعوے داروں کو یہ پتا نہیں کہ جمہوریت نام ہی یکساں حقوق رکھنے کا ہے۔ چاہے وہ سیاسی لیڈر ہوں یا پھر عام لوگ، سب یہاں کے وسائل پر برابر کا حق رکھتے ہیں۔ یہاں کے سیاست دان بنیادی جمہوری حقوق کی فراہمی کے حوالے سے عوام سے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں۔ وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر عوام کے ووٹ کی طاقت سے خود کو قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب کروا لیتے ہیں۔ بعض سیاستدان حزب اختلاف اور بعض حزب اقتدار کا حصہ بن کر پارلیمنٹ ہاؤس میں شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے مزین زندگی گزارنے لگ جاتے ہیں۔ جب الیکشن کا ماحول ہوتا ہے تو سیاست دان اور سیاسی جماعت عوام کے سامنے مختلف دلکش منشور پیش کر کے دل فریب نعرے لگا کر عوام کو فریب کاری کے دام میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ کبھی کسی کو سڑک، پل، بجلی، گیس، نوکریاں اور دیگر تحریصات کی ترغیب دے کر اپنے دام فریب میں الجھاتے ہیں تو کبھی روٹی کپڑا، مکان اور ووٹ کو عزت دو، کا خیالی تصور دے کر بہلایا جاتا ہے۔ در حقیقت ان سب کے پیچھے اپنا مطمعٔ نظر حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عوام الناس کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ بِلا سوچے سمجھے صرف اس امید پر کہ شاید ان کے حالات بدل جائیں، ان سیاسی جماعتوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ سیاست دان محض اپنے آپ کو سیاسی میدان میں موجود رکھنے کے لیے مختلف قسم کی تخریب کاریاں اور اپنے ہی جلسوں میں دھماکے کروا کے اپنی ہی پارٹی کے سیاسی کارکنوں کا لہو گراتے ہیں۔ وہ سیاسی کارکن جو اپنے مقدر اور بد نصیبی کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے ان کے ارد گرد

جمع ہوتے ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان تو کیا حاصل ہو گا وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جمہوریت، جمہوریت کا نعرہ لگا کر جمہور کے ہی بنیادی حقوق کا استحصال کرتے ہیں:

> ''جمہوریت کے فروغ کے اکٹھ میں شرکت محض ڈرامہ تھی۔ ''جمہوریت۔۔۔ یہ کیا چیز ہے۔۔۔؟ میں تو اس میلے میں چھ جی کے تن ڈھانپنے اور شکم کی ازلی آگ بجھانے کے واسطے مصروف جہاد تھا البتہ لفظ جمہوریت میرے کانوں میں پڑا ضرور تھا کچھ لوگ جمہوریت زندہ باد کا آواز لگا رہے تھے۔ میرے پلے کچھ نہ پڑا، میں بھوکا اور ننگا۔۔۔ بھوکے اور ننگے کا آوازہ تو ایک ہی ہوتا ہے، بس میں تو مفت میں مارا گیا۔۔۔ گھر میں رہ جانے والے پانچ جی بھی مفت میں مارے گئے۔'' 44

آج سیاست سوائے فریب، دغا بازی اور بے حسی کے کچھ نہیں۔ جمہوریت کا راغ الاپنے والے عوام سے ووٹ لیتے وقت ان کے بنیادی جمہوری حقوق کی حفاظت کے بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں مگر منتخب ہونے کے بعد ایسے غائب ہوتے ہیں کہ کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ الیکشن کا وقت آئے تو پندرہ بیس دن کے اندر اندر حلقے کی عوام کے پاس اور ہر گاؤں یہ سیاسی امیدوار پہنچ جاتے ہیں۔ منتخب ہونے کے بعد حلقہ کی ساری عوام انہیں دکھائی نہیں دیتی، اگلا الیکشن آئے جس کے آتے ہی ان کے پاس جینے مرنے والوں کی معلومات پہنچ جاتی ہیں۔ لواحقین سے تعزیت اور پرسہ کا ایک نیا دور چل نکلتا ہے۔ چاہے وہ لوگ ان کی بے حسی کی وجہ سے ہی ان کی مدد کا انتظار کرتے کرتے راہی اجل ہوئے ہوں۔ مگر یہ سیاسی بازی گر اپنے مفادات کے لیے اخلاقی رویوں کو بھی موقع محل کے حساب سے استعمال کرتے ہیں۔ دہلیز پر حقوق اور انصاف فراہم کرنے کا وعدہ کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ عوام کن مشکلات سے گزر رہی ہے۔ لوگ اپنے بنیادی جمہوری حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے کرتے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں مگر حصول حق کا خواب پورا نہیں ہوتا۔ حقوق کے حصول کے لیے اگر کبھی کامیاب ہو بھی جائیں تو بھی ایک نسل اس وقت تک مٹ جاتی ہے اور آنے والی نسل کو ان حقوق کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ احمد اعجاز سیاست دانوں کے رویوں کو اپنے افسانہ ''کہانی کی دستک'' میں ایک خاتون کی کہانی بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑتے لڑتے آنکھیں موند جاتی ہیں۔ جب اس کی بیٹی ان حقوق کی طلب گار ہوتی ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ بیٹا ہم مرنے والوں کو زکوۃ کے پیسے نہیں دیتے۔ وہ اگر مرنے والوں کو نہیں دیتے تو اس کے بعد والی نسل اگر زکوۃ کی مستحق ہے تو اس کو ہی دے دیے جائیں۔ لیکن اس کے لیے از سر نو جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید وہ بھی حقوق کے لیے تگ و دو کرتے کرتے قبر کے اندھیروں میں گم ہو جائے:

> ''بیٹا اماں کو مرنے سے ایک دن پہلے زکوۃ کا ایک ہزار کا چیک ملا تھا، اس کے مرنے سے پہلے افراتفری میں بنک سے پیسے نہیں لے سکتے آج جو سویرے سویرے لینے گئی تو بینک

> والے کہتے ہیں کہ بڑھیا جب تک خود نہیں آئے گی پیسے نہیں ملیں گے، میں نے انہیں بتایا کہ اماں اب اس دنیا میں نہیں ہے تو انہوں نے کہا کہ مرے ہوئے کو ہم زکوۃ کے پیسے نہیں دیتے، بیٹا بینک والے تمہارے جاننے والے ہیں ان سے کہہ دو کہ وہ مجھ کو میری اماں کے پیسے دے دیں۔"45

احمد اعجاز جنوبی پنجاب میں اردو افسانہ نگاروں میں منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے صحیح معانوں میں اس خطے کی معاشرتی و سماجی حوالوں سے پائی جانے والی محرومیوں اور درپیش مسائل کو اجاگر کیا۔ احمد اعجاز کے بارے منشا یاد لکھتے ہیں:

> "تمہارے افسانوں کو پڑھ کر ان کی اٹھان دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ تم ان سب خوبیوں اور بے چینیوں کی دولت سے مالا مال معلوم ہوتے ہو جو آدمی کو افسانہ نگار بناتی ہے۔ ابھی تم کہانی تلاش کرتے ہو لیکن میرا اندازہ ہے کہ ایک روز ایسا آئے گا جب کہانی تمہیں تلاش کرے گی اور اصرار کرے گی کہ مجھے احمد اعجاز ہی لکھے۔"46

جمہوریت کی ایک خوبی زندگی کے تمام معاملات میں افراد معاشرہ کو ہمہ قسمی حقوق کی یکساں فراہمی ہے۔ چاہے وہ صحت و تعلیم کے حوالے سے ہوں یا پھر انصاف کے معاملات، جمہوریت کی نظر میں سب لوگ یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔ مگر جنوبی پنجاب کے ہر شعبہ زندگی میں سیاست دانوں کے عمل دخل کی وجہ سے ان جمہوری حقوق کی فراہمی میں بہت رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں سیاست دان طاقت، اقتدار اور دولت کے بل بوتے پر اپنی پسند کا انصاف حاصل کر لیتے ہیں۔ انصاف کے تقاضے ہرگز پورے نہیں کیے جاتے۔ بعض اوقات افسران کو خرید لیا جاتا ہے۔ تو کہیں منصف خرید لیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی نہ بکے، اس کے دل و دماغ میں قانون و انصاف کی فراہمی کا سودا سمایا ہوا ہو اور کسی کو خاطر میں نہ لائے تو ایسے شخص کو توڑنے کے لیے بھی یہ سیاست دان سینکڑوں اوچھے ہتھکنڈوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی جان سے مارنے کا خوف تو کبھی بیوی بچوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ کبھی ناجائز مقدمات میں الجھا کر ساری نیک نامی مٹی میں ملا دی جاتی ہے۔ ایسے لوگ معاشرے میں کبھی امن و سکون قائم نہیں ہونے دیتے۔ قانون اور انصاف کے اوپر سمجھوتہ نہ کرنے والا انسان معاشرے میں ناپسندیدہ کردار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ کبھی خلاف قانون کوئی کام انجام نہیں دیتا، مگر جب ایسا شخص اپنے منصب سے سبکدوش ہو جائے تو ایسے شخص کو معاشرہ ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیتا ہے۔ ایسے منصفیں جنہوں نے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے کبھی غفلت نہ برتی ہو بعد از سبکدوشی سیاست دان اور بیوروکیریٹس اپنی اپنی بساط کے مطابق اس سے انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوران سروس بھی کئی مرتبہ ایسے شخص کو تنزلی اور دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس بھی سیاست دان کے احکام کی خلاف ورزی کرے وہی چڑھ

دوڑتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ان بدعنوان جمہوری عناصر کے ہاتھوں تختہ ستم بنا رہتا ہے۔ محمد حفیظ خان اپنے افسانہ ''اکیلا جاگتا ہوا آدمی'' میں ایک ایسے ہی جج کی آپ بیتی بیان کرتے ہیں جو اقتدار سے چمٹے ہوئے انصاف کے خریداروں کے بھیانک چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''میں یہ سب کچھ سستے اور فوری انصاف کے لیے کرتا ہوں۔ میں بلا مقصد پیشیاں نہیں دیتا، خواہ مخواہ سٹے نہیں کرتا، اہلکاروں کو رشوت نہیں لینے دیتا، قبضہ گروپ حوصلہ ہار بیٹھے ہیں، اب مقدمے دس برس میں نہیں بلکہ دو دو مہینوں میں فیصلہ ہو رہے ہیں سر آپ غور تو کریں، میرے خلاف شور مچانے اور ہڑتالیں کرنے والے کوئی مظلوم نہیں بلکہ ظالموں کے گروہ ہیں۔ یہ قبضہ گروپوں کے آلہ کار اور وہ بدترین اور کرپٹ لوگ ہیں جنہیں نہ تو جلدی فیصلوں سے غرض ہے اور نہ ہی یہ انصاف کے طلب گار۔۔۔۔ ناں تیرے جیسے جج کو کم از کم میں تو برداشت نہیں کر سکتا۔ بات کرائیں میری اوپر، بنائیں او ایس ڈی، تاکہ جناب فرصت سے بیٹھ کر انقلابی معاشرتی تبدیلیوں کے بارے اچھی طرح غور فرما سکیں۔''47

جمہوری حکومت ایسے نظام حکومت کا نام ہے جہاں عوام اپنے منتخب کردہ نمائندے کے ذریعے ایوانوں میں اپنے حقوق و فرائض کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ بنیادی جمہوری حقوق حاصل کر سکے۔ یہ جمہوری حق ہے کہ عوام الناس میں سے کوئی بھی اپنے انتخاب کردہ نمائندے سے وقوع پزیر ہونے والے معاملات کے بارے میں گفتگو کر سکے یا سوال اٹھا سکے۔ جنوبی پنجاب کے سیاست دان سیاست کو عوام کی خدمت و فلاح کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور مالی مفادات حاصل کرنے کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ سیاسی رنگ بازوں کا منشور اور نصب العین لحہ بہ لحہ تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک بیانیے کے ساتھ لوگوں سے اپنے لیے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور اپنے ہی بیانیے کو روندتے ہوئے اس سیاسی جماعت کی گود میں جا بیٹھتے ہیں جو اقتدار میں آنے والی ہوتی ہے۔ ایسے سیاست دانوں کا مطمعٔ نظر صرف اقتدار ہوتا ہے۔ یہ سیاست دان اقتدار کے گھوڑے بن کر مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں یہ فقط مفادات کے ہی بندے ہوتے ہیں۔ یہ ذاتی مفادات کے لیے کسی بھی گہرائی میں گرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد حیات قوت اور دولت ہوتا ہے۔ کچھ سیاست دان اپنی بدعنوانی اور کرپشن بچانے کے لیے ہر حکومت کی گود میں جا بیٹھتے ہیں تاکہ کوئی ان سے سوال نہ کر سکے کہ جب تم اقتدار کے ایوانوں میں آئے تھے اس وقت تو تمہاری مالی حالت اس قدر مستحکم نہ تھی، لیکن اب یہ کروڑوں اربوں روپے کہاں سے اور کیسے آئے؟ اگر کبھی عوام یا بہادر صحافی اس سے

سوال بھی کر بیٹھیں تو ان کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ نام نہاد سیاست دانوں نے جمہوریت کی آڑ میں عوام پر سول مارشل لاء مسلط کر رکھا ہے۔

''بدرالدین، تمہارے پوچھنے کا مطلب؟ تم تو۔ مجلس سے نکالے ہوئے۔ بد عقیدہ آدمی ہو۔ اور سنو، سب کچھ غیب سے آتے ہیں۔ تمہیں تو خیر، ان باتوں کا یقین ہی نہیں ہے۔ ہاں ہاں، بالم، میں نے یہی پوچھا تھا تا کہ یہ مہنگے مرکب آخر کون۔ دے جاتا ہے؟۔ تو میرے ساتھ کیا ہوا۔ کہا رجب شاہ نے کہ اٹھ جاؤ، میری مجلس سے۔۔۔ ہاں کہہ تو دیا تھا، تم نکالے ہوئے شخص ہو، سوال کرنے کی اجازت تمہیں نہیں ہے۔'' بدرالدین کا جی چاہا، اس کے پیر رجب شاہ کے حق میں ''دو چار سچ اگل دے۔ مگر بالم اس دوران میں، بڑبڑاتا ہوا، نکل بھاگا۔''48

اس خطے میں جمہوریت کے نام پر ہمیشہ سے دوغلہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس خطے کی سیاست جاگیرداروں اور پیروں کے قبضہ میں ہے۔ یہ پیر بھی تو جاگیردار ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیشہ عوام کو لوٹا اور اگر کوئی ان کے بارے کچھ اختلاف رائے رکھے تو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ یہ پیر، سردار، جاگیردار جو اس خطے کے حکمران بنے ہوئے ہیں ان کو عوام کا کوئی احساس نہیں۔ ان کو جمہوریت یا انسانیت کی بھلائی اور بہتری کا علم تک نہیں یہ تو صرف اپنے نظام اور علاقے پر گرفت رکھنے کے ساتھ ساتھ نام کے جمہوری حکمران ہیں۔

''جمہوریت کے نام پر پاکستان میں حکومت کرنے والے جاگیردار سجادہ نشین فوجی جرنل اور گماشتہ سرمایہ دار ہیں جو لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں شہری نہیں۔ اس لیے جمہوریت پر انہی طبقات کا قبضہ ہے کیوں کہ ہمارا معاشرہ ارتقائی مراحل سے گزر کر جمہوریت اور اس کی روایات سے آگاہ نہیں ہوا۔ اس لیے نہ تو اس کی سوچ جمہوری ہے اور نہ ہی اس کے رویے۔''49

جمہوریت نالائق، کرپٹ سیاست دانوں کی لپیٹ میں آکر اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ ان سیاست دانوں نے جمہوریت کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔ یہ سیاست دان جس عوام کو اپنے مظالم کا نشانہ بناتے ہیں، سیاست کو خدمت کے بجائے جبر اور انتقام کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ اقتدار یا امارت لوگوں پر طاقت کا ظالمانہ استعمال کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ قوم کا نمائندہ یا سردار دراصل اس کا خدمت گار ہوتا ہے۔ یہ سفاک سیاست دان حکومت و اقتدار کے حقیقی منشور کو بھول گئے ہیں۔ یہ لوگوں فقط گنتی کے طور پر دیکھتے ہیں، عام لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا کچھ بھی

احساس نہیں۔ عام آدمی اس خدشے میں مبتلا ہے کہ اگر کبھی اس کے منہ سے غلطی سے بھی ان سیاست دانوں کے خلاف کچھ الفاظ نکل جائیں تو وہ قابل معافی ہوں گے یا نہیں؟ یا پھر انہیں بھی مستحق ستم بنادیا جائے گا۔ علی تنہا جنوبی پنجاب کے افسانوی ادب میں ایک باا ثر مزاحمت کار کے طور پے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانہ ''تابوت اٹھانے والے'' میں جنوبی پنجاب کے سیاست دانوں کے ان جبری رویوں کے خلاف علامتی انداز میں غریب عوام کے جمہوری حقوق کی پامالی اور ان پر ہونے والے مظالم کو پر زور الفاظ میں بیان کیا ہے :

> ''اب کیا ہونے لگا، یہ تو ہے نرا ظلم مگر اب کہو، ہو گا کیا؟'' اب غریب شاہ وہی ہو گا، جو دوسروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ تمھیں جھوٹے الزام میں دھر لیا جائے گا۔ جھوٹ کی حکمرانی ہے۔ جو سرتابی کرتا ہے، اسے سیدھا قید خانے بھیج دیا جاتا ہے، آیا سمجھ مبارک میں۔ ''تو کیا مجھے مار دیا جائے گا؟'' 50

تقسیم ہند سے لے کر تا حال مملکت خداداد میں جمہوری حکومتوں کا دورانیہ نسبتاً مختصر رہا ہے۔ کبھی ڈکٹیٹروں کی چھتر چھایہ میں وقوع پذیر ہونے والی لولی لنگڑی جمہوریت سامنے آئی تو جمہوریت نے ہی جمہوریت کی بساط الٹ دی۔ سیاسی جماعتوں اور سیاسی قائدین کی بھر مار ہے لیکن اکثر سیاسی عمائدین سیاست اور جمہوریت کی ابجد کے بھی شناسا نہیں ہیں۔ جہاں ان کو اپنا فائدہ نظر آیا، وہیں لڑھک جاتے ہیں۔ ان کو جمہوریت سے زیادہ اپنے مقاصد عزیز ہوتے ہیں۔ یہ سیاست دان اپنے مطلب کے لیے کسی بھی حد تک گر جاتے ہیں۔ ملکی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بارہا منتخب جمہوری حکومتوں کا تختہ کبھی مارشل لاء ڈکٹیٹر نے الٹ دیا اور کبھی نام نہاد جمہوریت پسند سیاسی رہنماؤں نے ہاتھوں میں جمہوریت کا علم اٹھا کر ہی جمہوری حکومت کو شکست دی۔ جمہوریت کا قتل کئی طرح سے کیا گیا، بسا اوقات عالمی طاقتوں کے کاسہ لیس سیاست دانوں نے منتخب جمہوری حکومتوں کو ادھیڑ ڈالا اور عالمی طاقتوں کے استعماری نظام کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے۔ کبھی کبھی ان جمہوری حکومتوں کے خلاف جمہوریت کا راگ الاپنے والے مفاد پرست گروہ سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں نے محض مفادات کی خاطر یا اقتدار کی حرص میں جمہوری حکومتوں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کا حصہ بنے اور اس طرح جمہوریت نے ہی جمہوریت کا گلہ دبا دیا۔ اگر جمہوری حکومت کوئی مثبت اقدام بھی کرتی ہے تب بھی حذب اختلاف اسے منفی رنگ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ہر طرف ناکامی کا سامنا ہو تو پھر ارکان پارلیمنٹ کی خرید و فروخت ہوتی ہے، نمائندگان ایوان کی بولیاں لگتی ہیں۔ خزانوں کے منہ کھول دیے جاتے ہیں، حریص سیاست دان دولت کے ترازو میں تل کر بکنے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں منتخب جمہوری حکومت کو عدم اعتماد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح جمہوری حکومت ان بکاؤ جمہوری سیاست دانوں کے مفاد کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ایسے سیاست دان جمہوری حکومت کا جزو بن جاتے ہیں۔ پہلے جس کی مخالفت کرتے ہیں بعد میں اپنا فائدہ دیکھ کر

پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی گود میں جا گرتے ہیں۔ہیں۔ان کا مقصد سیاست موسموں سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔عدم اعتماد کی تاریخ یہاں پرانی چلتی آ رہی ہے جس کا سامنا مختلف جمہوری حکومتوں کو رہا ہے۔راشدہ قاضی نے اپنے افسانہ ''سیٹی'' میں ان مفاد پرست سیاست دانوں اور ان کی سازشوں کے ذریعے جمہوری حکومتوں پر شب خون کی روودادیوں تحریر کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ جب بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونی تھی۔ میں بے حد پریشان تھی کہ پھر ایک منتخب حکومت بیورو کریسی کی سازشوں کا حصہ بن جائے گی۔ میں اپنے ایک ترقی پسند استاد سر علی افتخار صاحب کے پاس گئی۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پوچھا کہ اب کیا ہوگا۔۔۔۔انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور کہا کہ بے فکر رہیں۔ دل کا ایک کونا بہت مطمئن ہے۔ اللہ کرم کرے گا۔ میں یہی امید کا جگنو لے کر ہوسٹل کی سمت روانہ ہوئی۔ راستے میں مخالف مذہبی متشدد جماعت کے چند لڑکوں نے مجھے دیکھا اور چڑانے کے لیے سینہ کوبی شروع کر دی۔اور ساتھ ہی آنکھوں کو ملتے ہوئے کہتے رہے ہائے نظیراں لٹی گئی۔ ''51

فی زمانہ سیاست دان اپنی سیاسی مضبوطی کے لیے ہمہ قسمی حربے استعمال کرتے ہیں۔ مختلف برادریوں اور خاندانوں کے سربراہوں کو کچھ مفادات دے کر خرید لیتے ہیں یوں ان کے ذریعے ان سے سیاسی اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں تعلیمی اداروں میں مختلف طلبا تنظیموں کے ذریعے سیاسی سکہ جمار کھا ہے۔ مذہب پسند اور عقیدت پرست عوام میں سیاسی اثرات قائم کرنے کے لیے ان سیاست دانوں نے بڑے بڑے مذہبی علماء اور بڑی بڑی درگاہوں کے گدی نشینوں کو مختلف مراعات دے کر اپنا سیاسی قد کاٹھ بڑھانے کے لیے اپنی اپنی سیاسی جماعتوں میں شامل کر رکھا ہے۔ جو ان کے تمام نا قابل بیان کرتوت اور ناگفتہ بہہ کردار پر نا صرف پردہ ڈال رکھا ہے بلکہ ان مذہبی پنڈتوں اور دکاندار گدی نشینوں کے ذریعے اپنے آپ کو مقدس ثابت کر رکھا ہے۔ یہ مذہب کا دھندا کرنے والے ملا، لوگوں کی عقیدت اور ارادت کو اپنے آستانوں کی آبادکاری اور مذہبی دکانداری چمکانے والے یہ سجادہ نشین عوام الناس میں ان سیاسی چغادریوں کے سیاسی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ ایک طرف غریب عوم ان سیاسی بازی گروں کی بد عنوانیوں کی وجہ سے اندوہناک حالات سے دوچار ہیں تو دوسری طرف یہ نام نہاد مذہبی پیشوا اپنے مقام پر اس عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ عوام سیاست دانوں کی ٹھگ بازیوں سے اکتا کر اگر انہیں چھوڑنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو یہ زر خرید مذہبی پروہت اپنے ساتھ عوام کی عقیدت مندی اور ارادت کا فائدہ اٹھا کر نئے سرے سے سیاسی شکاریوں کے جال میں پھنسا دیتے ہیں۔ یہ سیاست دان ہوں یا دین فروش گدی نشین سب عوام کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ عوام ہمیشہ ان

سیاسی و مذہبی بازی گروں کے ستم کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ یہ مذہبی شخصیات اور آستانوں کے بد کردار مجاور بظاہر جمہوریت کے علم بردار نظر آتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ سیاسی حکومت ہے تو یہ سیاست دانوں کی چاپلوسی کرتے ہیں اگر سیاسی حکومت کا تختہ الٹ جاتا ہے اور فوجی آمر حکومت پر مسلط ہو جاتا ہے تو ان کے مفادات کا قبلہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہ جمہوریت کا نعرہ لگانے والے پھر بدترین آمر کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتے ہیں۔

> ''تب ہمارے دنیاوی رتبے پانے والے مخدوم کے ایک خاندانی خادم نے، جس نے چھ جماعتیں میرے ساتھ ہی مدرسے میں پڑھی تھیں، میرے کان میں کہا تھا کہ تم ہمارے والے مخدوم کی باتوں اور تقریروں سے مایوس ہو جاتے ہو، نہیں جانتے کہ ہمارے حصے میں برکتوں والے کا سرآیا ہی نہیں تھا۔ بہر طور دستاریں اور کرامتیں بیچنے والے یہ معزز گورکن اپنے اپنے شجروں کی تصدیق شدہ کاپی لے کر ڈکٹیٹروں کے دربار میں بھی بار پاتے رہے اور اب جمہوریت کے محدود وقفے میں عوام کے نمائندے بننے کے حرص میں بھی ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔'' 52

کل بھی ارباب سیاست مکر و فریب کے جال بنتے تھے اور آج بھی ان کا دام تذویر ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ اس خطے کو ہمیشہ عظیم سے عظیم تر بنانے کے سہانے سپنے دکھائے گئے۔ ہزاروں نوکریاں، اچھا روزگار اور ہمہ قسمی سہولیات دیں گے، اس خطے کی عوام کی تقدیر ہی بدل دیں گے۔ مگر یہ سب لاحاصل اور بے سود ہیں۔ ہر آنے والا سیاست دان بڑے بڑے دعووں کے ساتھ آتا ہے مگر عملی نتائج نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جنوبی پنجاب کی عوام نسل در نسل ان سیاست دانوں کی فریب کاریوں کا شکار ہوتی چلی آرہی ہے۔ ہر آنے والی نسل ان طاقتور سیاست دانوں کے جبڑوں میں دبی ہوئی تڑپ رہی ہے۔ ان لوگوں نے جنوبی پنجاب کی عوام کو مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ جاوید اختر بھٹی جنوبی پنجاب کے اردو افسانوی ادب کی ایک معتبر آواز ہیں۔ جو علامتی پیرائے میں اس خطے کی عوام کی بے بسی اور مفلوک الحالی کا بتاتے ہیں کہ آنے والی نسل گزشتہ نسل کو ان سیاست دانوں کے جبر و استبداد سے بچانے کے لیے فریاد بھی کرتی ہے تو پرکھوں کی روحیں جواباً ایک ہی بات کرتی ہیں کہ ہمارے بچو! جبر و استبداد کی زنجیروں کو توڑنا تمھارے بس کی بات نہیں اور نہ ہمارے بس کی بات کیونکہ ہم انہی زنجیروں کے قیدی رہے ہیں:

> ''ہاں پھر اب تک ''تو'' اور ''میں'' کی خاموشی کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔ ایسا سفر جسے طے نہیں کرنا پڑتا، بلکہ وہ خود بخود ہی طے ہوتا رہتا ہے۔ ''بابا۔۔۔ بابا'' ہم راکھ کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں' ہمیں نکالو'' ''میرے بچو' میں مفلوج جنگی قیدی ہوں۔'' 53

جنوبی پنجاب میں جمہوریت پرست نام نہاد سیاست دان ہمیشہ فریب کاری کے تانے بانے بنتے رہے۔ یہ لوگ اس خطے کی عوام کو نت نئے سبز باغ دکھا کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں مگر یہاں کے باشندوں کو جمہوری حقوق فراہم کرنے کی بجائے ان کے نام پر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے محروم القسمت لوگ نسل در نسل ان کے مظالم کا ہدف بنتے آرہے ہیں۔ ان سیاست دانوں نے عوام کو نسلوں تک اپنا غلام بنانے کی ٹھان لی ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس خطے کی عوام نے بھی اس غلامی کو مقدر سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔

د: مارشل لاء کے خلاف مزاحمت! افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

دنیا اور اس کا وجود مختلف ریاستوں میں منقسم ہے۔ کچھ ریاستوں میں شاہی، جمہوری طرز حکومت اور بعض ریاستوں میں فوجی ڈکٹیٹروں نے ریاست کے اقتدار پر قبضہ جما رکھا ہے۔ جمہوری نظام حکومت عوامی رائے سے منتخب ہونے والے نمائندے قائم کرتے ہیں۔ مارشل لاء سسٹم میں بعض اقتدار پرست جرنیل اپنی ہوس اقتدار کو پورا کرنے کے لیے ملک کے آئین کو معطل کر کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔

''فوج جب کسی ملک کا اقتدار سنبھال لیتی ہے تو اسے مارشل لاء کہا جاتا ہے۔''54

پاکستان میں پہلی مرتبہ مارشل لاء ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جرنل محمد ایوب خان نے لگایا۔ دوسری مرتبہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان نے لگایا، تیسری مرتبہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جرنل ضیاالحق نے لگایا۔ اور چوتھی مرتبہ مارشل لاء ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے لگایا۔ مارشل لاء دراصل مطلق انصافی کا نظام حکومت ہے۔ جس میں عوامی نمائندوں، عوامی رائے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی کسی کی کسی معاملے میں شنوائی ہوتی ہے۔ مارشل لاء میں صرف حکم جاری کیے جاتے ہیں۔ مارشل لاء کے نفاذ سے ملکی آئین اور بنیادی حقوق تعطل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی نقل و حرکت، آزادی اظہار رائے اور بنیادی عوامی حقوق پر قدغنیں لگ جاتی ہیں۔ جمہوری دور حکومت میں عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ عوامی نمائندے کرتے ہیں جبکہ مارشل لاء کے نفاذ سے آئین کا تعطل ہو جاتا ہے تو آئین میں موجود ملکی باشندوں کو دیئے گئے حقوق بھی معطل ہو جاتے ہیں۔

> ''آمرانہ دور میں اختیارات محدود ہو کر ایک فرد کی ذات میں جمع ہو جاتے ہیں اور آزادی رائے اظہار کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اس لیے عوام سیاست سے دور ہو کر ریاست سے اپنے تعلق کو ختم کر لیتے ہیں۔ آمرانہ حکومتیں ہمیشہ جبر اور تشدد کے ساتھ اپنے اقتدار کا تحفظ کرتی ہیں۔ ان کے تحفظ کے لیے فوج، پولیس، خفیہ ادارے اور بیوروکریسی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔''55

مارشل لاء بعض اوقات ایسے وقت میں بھی نافذ کیا جاتا ہے جب ملکی افواج اہل سیاست سے ملکی انتظامی معاملات چلانے کے حوالے سے مایوس ہو جاتے ہیں یا پھر ملک پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے یہ اقدام کرتی ہیں۔ فوج اپنے خیال کے مطابق ملک اور عوام سے خیر خواہی کرتی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارشل لاء ملکی عوام کے حقوق کے استحصال کا دوسرا نام ہے جہاں جبر، ناانصافی اور دھونس اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ ناپسندیدہ سیاست دانوں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے۔ فوجی ڈکٹیٹروں کے خلاف آواز بلند کرنے والے صحافیوں، ادیبوں کو پابند سلاسل کیا جاتا ہے، ان کی پیٹھ پر کوڑے مارے جاتے ہیں۔ ظلم و جبر کا اندھیرا جتنا بھی گہرا ہو مگر روشنی کے متلاشی ہر گام روشنی کی جستجو میں مسلسل عازم جدوجہد رہتے ہیں۔ ان مارشل لاء ڈکٹیٹروں کے خلاف اپنی مزاحمتی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ مارشل لاء میں مختلف حربے آزمائے جاتے ہیں۔ جن کا مقصد اپنے اقتدار کو طوالت دینا ہے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اپنے کاسہ لیس، خوشامدی اور ان کی سوچ میں ڈھل جانے والے بعض سیاست دانوں کو اقتدار سونپ کر پس پشت خود حکومت کرتے ہیں۔ یوں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جمہوریت کے لبادے میں اپنے مضموم ارادوں کے تحت اقتدار کے مزے لوٹتا ہے۔ مارشل لاء ایڈمینسٹریٹر ہر شعبہ اپنی پسند کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ میڈیا اس کی زبان بولتا ہے، عدالتیں اسی کا بتایا ہوا انصاف مہیا کرتی ہیں۔ یہ اپنے من پسند قوانین بنا کر نافذ کرتے ہیں۔ اگر ان قوانین سے کوئی ذراسی بھی سرتابی کرے تو اس سے زندگی کا سکون یا زندگی ہی چھین لی جاتی ہے۔ درحقیقت مارشل لاء ناانصافی اور ظلم کا نظام ہے۔ کوئی ملک / قوم اور اس کی بقا اس بات میں مضمر ہے کہ اس ملک یا قوم کی نظریاتی اور جغرفیائی حدود کے محافظ، اس کا دفائی نظام کس قدر مضبوط ہے۔ پاکستان میں سے دفائی نظام تو مضبوط ہے مگر بدقسمتی سے محافظین اپنے آپ کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نت نئے آمرانہ حربے اپناتے رہتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں ملکی جمہوریت پر شب خون مارتے ہوئے جمہوریت کو اوور ٹیک کرتے ہوئے مارشل لاء نافذ کر دیتے ہیں۔ ان کا اصل مقصد ملک یا قوم کی ترقی اور خوشحالی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دل میں بھی اقتدار کی ترنگ اٹھتی ہے۔ وہ اقتدار کے مزے لینے کے لیے اقتدار کا جھولا جھولنے لگتے ہیں۔ ایسے عناصر کو عوامی حقوق، عوامی رائے کی ذرا بھی پاسداری نہیں ہوتی۔ دوسری طرف ملکی عوام حسن زن رکھتے ہوئے اپنے ان محافظین کی محبت میں سرتاپا غرق دکھائی دیتی ہے۔ اپنے وطن کے ان رکھوالوں کے سامنے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کیے رکھتی ہے۔ عوامی سطح پر وطن کے ان پاسبانوں کی پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی علاقے میں ان نگہبانوں کے گروہ کا کوئی فرد دکھائی دے یا اس طبقے کا حصہ بن جائے تو لوگ احساس تفاخر سے پھولے نہیں سماتے، طرح طرح سے اپنے رشک کا اظہار کرتے پھرتے ہیں۔ جب کبھی یہ مطلق العنان عناصر اپنے لیے کسی قسم کا کائی خدشہ محسوس کرتے ہیں تو بجائے شجاعت و بہادری کے اس خدشے کا مقابلہ کرنے کے اس طرح کے قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے کہ بعض عام افراد کو بھی ان کے تعین کردہ علاقوں میں دیکھ لیا جائے تو وہ چھان بین کرنے کی بجائے براہ راست گولیوں سے اڑا دیتے ہیں۔

یوں اپنے محافظین پر اِترانے والی قوم کے یہ افراد اپنے ہی نگہبانوں کے ہاتھوں موت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں، گویا محافظ قاتلوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مارشل لاء کی کارستانیوں اور اس کے مضر اثرات کو لیاقت علی نے اپنے افسانہ ''مہیب سائے'' میں چچا علیا کے روپ میں عوام کی سادگی اور اپنی محافظ فوج کے ساتھ محبت، احساس تفاخر کو استعارے کے طور پر پیش کیا ہے جبکہ ملکی عوام کے ادا کردہ ٹیکسز سے وظیفہ خوری کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے والے قوم کے فرزندوں کے روپ میں مارشل لاء ڈکٹیٹروں کا بھیانک چہرہ عیاں کیا ہے۔ جو ذرا سے خدشے کی بنا پر بجائے عوام کی حفاظت کے ان کے لیے خون آشام درندوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ سادہ لوح عوام مارشل لاء کے ان جابرانہ، ظالمانہ عناصر کے ظلم کا شکار اپنی جان دے کر ملک کے پاسبانوں سے اپنی محبت کا اخراج ادا کرتی ہے:

> ''علیا چاچا جو تمام عمر گاؤں کی چوپالوں اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ہر آنے جانے والے کو فوج کی بہادری اور عظمت کے قصے سناتا آیا تھا، آج چھاؤنی کی اس بڑی شارع پر محض اس لیے خون میں لت پت پڑا تھا کہ اس نے سوچا تھا، بھلا اپنے گھروں میں بھی کوئی شناخت کا محتاج ہوا کرتا ہے۔۔۔؟''56

پاکستان کے وجود کا اصل مقصد ایک آزاد ریاست مستقل بنیادوں پر قائم کی جائے۔ جہاں اسلامی جمہوریت کے ترقی پرور اصولوں کو نافذ کر کے معاشی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی معاملات اسلامی حکام شریعت کے مطابق نافذ کیے جائیں اور حکومت مطلق العنان حکمران نہیں بلکہ عوام کے چنیدہ، باکردار افراد ملک کی بھاگ دوڑ سنبھال کر اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ مگر افسوس قیام پاکستان کے صرف دس سال بعد ملک میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹا کر پہلا فوجی ڈکٹیٹر سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اقتدار پر قبضہ کر کے مارشل لاء نافذ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کے حصار میں رہ کر حکومتی معاملات چلاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء کے دونا تمام آئین پاکستان کے جریدوں کا مزاق اڑاتے ہوئے اس کو فوجی بوٹوں تلے روند کر اپنی پسند کے قوانین نافذ کر لیتا ہے۔ پہلے تو مارشل لاء کی دعوت جمہوری حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے فوجی ڈکٹیٹروں کو مہیا ہوئی۔ سکندر مرزا نے بنفس نفیس ان کو یہ موقع فراہم کر کے ملک میں امن وامان کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ ویسے تو پاکستان میں پہلا مارشل لاء صرف امن وسلامتی کے معاملات بحال کرنے کے لیے لاگو کیا گیا مگر اقتدار کا نشہ جس کے سر چڑھ کر بولے تو رہتی زندگی تک اقتدار کا یہ نشہ اترنے کا نام نہیں لیتا۔ کچھ وقت کے لیے مسلط ہونے والا یہ مارشل لاء ملک کی عمر کے دس سال کھا گیا۔ اس سے پہلے مارشل لاء کے تحت نظریہ ضرورت، ملکی آئین و قانون کو معطل کر کے فوجی ڈکٹیٹر نے اپنا قانون نافذ کر ڈالا۔ جاوید اختر بھٹی نے اپنے افسانہ ''تماشا جاری ہے'' میں پہلے مارشل لاء کے معروضی حالات اور واقعات کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

''میں آپ کی خدمت کے لیے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ میں ان کی تمام پریشانیاں دور کر دوں گا۔ یہ لو کتاب، میں تمہارے لیے یہ کتاب لایا ہوں۔ اس کو آئین کہتے ہیں۔ یہ تمہارے ملک کا آئین ہے۔ جب سکندر اپنا کردار ادا کر رہا تھا تو ایک فوجی جوان اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ سکندر کی تقریر ابھی جاری تھی کہ فوجی جوان اسے دھکا دیا۔ وہ اپنے آئین سمیت اسٹیج سے باہر جا گرا۔ سکندر نے ایک لمحے کے لیے فوجی جوان کی طرف دیکھا اور پھر ایک طرف چل دیا۔ فوجی جوان نے کہا۔ میرا نام ایوب خان ہے۔ میں تمہارا مقدر ہوں۔ میں نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا ہے۔ ایک بڑی کرسی اسٹیج پر رکھ دی گئی اور اداکار ایوب خان اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''57

ملکی سیاسی صورت حال اور عسکری قیادت کے بارے لارنس زائرنگ لکھتے ہیں :

''ایوب شدت کے ساتھ اس رائے سے وابستہ ہو گیا کہ ۔۔۔ جمہوریت جس طرح مغربی نظریہ میں بیان کی گئی ہے اور شمالی اوقیانوس کی قوموں میں عمل پیرا ہے پاکستان میں منتقل نہیں کی جا سکتی۔ ''58

جنرل محمد ایوب خان کو اقتدار کے آخری دنوں ملک میں جمہوریت نافذ کرنے کا درد اٹھنے لگا۔ اس نے خود کو محفوظ کرنے کے لیے صدارتی ریفرینڈم کرایا پھر صدارتی انتخاب میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی عظیم بہن فاطمہ جناح کے مدمقابل انتخاب کے اکھاڑے میں اترا۔ بزور طاقت اور دیگر چال بازیوں کے ساتھ الیکشن جیت گیا، یوں قوم کی عظیم ماں ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئیں، جو کہ ایک فوجی آمر کے کردار کا اور ملکی تاریخ کا گھناؤنا باب ہے۔ انہیں دنوں ایک پرجوش اور عزم صمیم کا مالک، جوشیلا انداز خطابت رکھنے والا ایک ذہین سیاست دان میدان عمل میں اترا اس نے فوجی ڈکٹیٹر کو للکارا۔ اپنی اسی ہمت و بہادری کی بنا پر وہ عوام میں مقبول ہو کر ابھرا۔ ایوب خان نے ۱۹۶۶ء میں صدر منتخب ہونے کے بعد جنرل یحییٰ خان کو اپنے بعد فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ ۱۰۶۹ء میں جب ایوب خان نے عہدہ صدارت سے استعفیٰ دیا تو صدارت کا منصب بھی جنرل یحییٰ خان نے اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔

''جنرل ایوب کے مستعفی ہونے پر اب یہ جنرل یحییٰ تھے جنہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو دوسرا مارشل لاء ملک پر مسلط کر دیا۔ یہ دوسرے نئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اسی شان سے نمودار ہوئے۔ ۱۹۶۲ء کا دستور منسوخ کیا، اسمبلیوں کو رخصت کیا، سیاسی سر

گرمیاں ممنوع قرار دی گئیں۔ پھر وہی دعویٰ دہرایا گیا کہ یہ مارشل لاء ملکی سالمیت، یکجہتی اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کی خاطر لگایا گیا ہے۔"59

یہ دونوں عہدے جنرل یحییٰ خان کے پاس ہونے کی صورت میں ان کا دماغ ساتویں آسمان پر محوِ پرواز ہو گیا۔ یحییٰ خان کردار اور طرز عمل سے ایک عیش پرست اور بھنورا صفت کردار کے مالک تھے۔ جن کا کام کبھی کلی پر منڈلانا، کبھی اس پھول کا رس چکھنا، کبھی مائے نوشی میں مدہوش رہنا ان کے لیل و نہار کا وطیرہ ٹھہرا۔ یحییٰ خان کو ایک عیاش کے طور پر تاریخ میں یاد رکھا جاتا ہے۔ یحییٰ خان نے اپنی ہوس پرستی کی تسکین کے لیے شوبیز کی گئی شخصیات کو فلمی پریوں کے دلال کے طور پر متعین کر رکھا تھا۔ جو ان کی تسکین کے لیے سامان داؤ عیش فراہم کرتیں۔ ان کے علاوہ مختلف سیاست دانوں اور ملک کی اشرفیہ کے مختلف گھرانوں تک ان کے حریص ہاتھ نہ صرف دراز ہوئے بلکہ ان کی عزت کی دھجیاں بھی اڑائیں۔ یہ ملکی تاریخ کا بہت بھیانک مارشل لاء تھا۔ جب ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور وطن کے رکھوالے شراب کے نشے میں دھت ہو کر شباب کی آغوش میں لپٹے ممنارہے تھے۔ جنرل یحییٰ خان نے اپنے اقتدار کو ڈگمگاتا دیکھ کر اس دور کے معروف سیاست دان کے پرزور سیاسی مطالبے سے تنگ آکر انہیں پابند سلاسل کر دیا۔ تاہم اس فوجی ڈکٹیٹر کو ان سیاست دانوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے، کہ پابند سلاسل رہ کر بھی جن کا مطالبہ پاکستان میں جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ یہ دونوں شخصیات شیخ مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو کے روپ میں سامنے آئیں۔ شیخ مجیب الرحمن نے ملک کے مشرقی بازو میں پوری طرح سے انتخابی کامیابی حاصل کی اور مغربی حصے میں ذوالفقار علی بھٹو کے نے، مگر دونوں اپنی اپنی حکومت بنانے پر بضد تھے۔ اقتدار کی ہوس ان سیاست دانوں کے سر چڑھ کر بول رہی تھی مگر ذوالفقار علی بھٹو فوجی ڈکیٹیٹر کی آغوش میں بیٹھ کر شیخ مجیب الرحمن کو غدار ثابت کرنے میں کامیاب رہا۔ اس غداری کو آڑ بناتے ہوئے مشرقی پاکستان میں فوج اتار دی۔ جس سے مشرقی پاکستان میں علاقائی تعصب کو ہوا ملی۔ لسانی اور نسلی بنیادوں پر اپنے ہی ملک کی فوج کے ساتھ عوامی ہتھیار بند مزاحمت شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں ان سیاست دانوں نے آپس میں مک مکا کر کے اپنے اپنے اقتدار قائم کرنے کے لیے اُدھر تم اِدھر ہم کا نعرہ لگایا، جس کا منطقی انجام ملک کے دولخت ہونے پر ہوا۔ یوں جنرل یحیٰی خان کی شراب نوشی اور شباب پرستی ملک کے لیے ایک خطرناک حقیقت بن گئی۔ جب ڈھاکہ میں حالات بے قابو ہو رہے تھے تو جنرل یحیٰی خان عورتوں کے ننگے جسم پر شرابیں بہا بہا کر ان کو چاٹنے میں مصروف عمل تھے۔

"میرا نام یحییٰ خان ہے، ملک میں مارشل لاء لگ چکا ہے۔ نعرے بند کرو۔ ہم الیکشن کرائیں گے۔ اور جمہوریت لے کر آئیں گے۔ شور نہ کرو ہم شور پسند نہیں۔۔۔ چند فوجی جوان ایک شخص کو پکڑ کر لے آتے ہیں۔ یحییٰ خان نے شراب پیتے ہوئے اور ایک خاتون

کا بوسہ لیتے ہوئے پوچھتا ہے۔ "یہ کون ہے؟" "سر یہ غدار ہے" "کیا نام ہے۔ ہمارے اس غدار کا؟" "شیخ مجیب الرحمن ۔ " "کہاں سے لائے ہو، ہمارے اس غدار کو؟" "مشرقی پاکستان سے" "لے جاؤ، جیل بھیج دو۔ ہمارے اس غدار کو۔" مے نوشی کرتے اور عورتوں سے دل لگی کرتے ہوئے۔ قریب کھڑے خوبصورت اور سمارٹ نوجوان سے یحییٰ خان پوچھتا ہے۔ "نوجوان تم کون ہو؟" "میں ذوالفقار علی بھٹو ہوں" "تم بہت ذہین ہو۔ کیا چاہتے ہو؟" "الیکشن، الیکشن اور صرف الیکشن۔" "الیکشن ضرور ہوں گے۔" 60

جب جب قد آور سیاسی راہنماؤں نے عوام کی طاقت یا قوت کے بل بوتے پر ملک میں اپنا سیاسی غلبہ یا تسلط پیدا کرنے کی کوشش کی تب تب ان سیاسی راہنماؤں کو اقتدار کے رسیا طاقت ور فوجی جرنیلوں کی طرف سے شدید جبر کا ہدف بنایا گیا۔ پاکستان کی تاریخ خوف ناک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں اور ان کے سیاہ کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ مختلف مواقع پر مارشل لاء کی آڑ میں سیاست یا جمہوریت پر پوری طاقت سے حملے کیے گئے۔ سیاسی و جمہوری رہنماؤں اور حکومتوں کو مارشل لاء کا اژدھا بے دریغ اپنے مہیب پیٹ کی غذا بنا گیا۔ ایسا ہی ایک اندوہ ناک واقعہ جس نے ملکی تاریخ پر اپنے دردناک ان مٹ نقوش چھوڑے ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کا ہے۔ جب اس وقت کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملک کی پسندیدہ، نامور سیاسی قیادت کو مختلف حیلوں کی آڑ میں نہ صرف یہ کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹا یا بلکہ اپنے مضموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اس وقت کے ہر دل عزیز رہنما کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ علی تنہا اپنے افسانہ "ایک اور چار تاریخ" میں حکم داد کو فوجی مارشل لاء ڈکٹیٹر کے علامتی روپ میں اس کی مکارانہ فریب کاریوں اور چال بازیوں کا کچا چٹھا کھولتے ہیں۔ وہ عیاری یا مکاری کے مختلف سوانگ رچا کر کس طرح اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سیاسی لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں :

"شام کے ملگجے اندھیرے میں اب چٹان پر رکنا خطرناک تھا۔ وہ ہلکی لہروں کو دیکھ کر 'دوڑتا ہوا' چٹان سے اتر کر، ساگر میں چھلانگ لگا کے 'دس فٹ ہی تیرا ہو گا کہ 'دریا میں چھپے اژدھا نے ایک دم وریام کی گردن کو جبڑے میں دبوچ لیا۔ سردار حکم داد نے، جلدی سے گن اٹھائی' دو فائر کر کے اژدھے کا 'گھڑے سا سر اڑا دیا۔ اژدھے کے منہ سے 'وریام کی گردن سے بہتا خون چھوٹ کر دریا میں وہ کہانی چھوڑ گیا' جس کے بارے میں، چار تاریخ سے اسے خبردار کیا گیا تھا۔" 61

دو تہائی اکثریت سے ووٹ لے کر بھرپور عوامی حمایت سے منتخب ہونے والے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو مختلف الزامات کے تحت معزول کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ۲۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا دن سیاہ دن کے طور پر نہیں بلکہ روسیاہی کے دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ جب اقتدار کے پجاری ایک ظالم آمر نے ملک پاکستان کا آئین توڑ کر منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لاء کا نفاذ کر دیا۔ اس دن سے پاکستان میں جمہوریت ایسے بے راہ روی کا شکار ہوئی ہے۔ پھر دہائیوں تک عوام حقیقی جمہوریت سے ناآشنا رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب جمہوری حکومت پوری آب وتاب سے جاری تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دل میں اسلامی ممالک کا بلاک اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا خیال ستانے لگا۔ ذوالفقار علی بھٹو اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان لے آیا۔ یہ دونوں باتیں عالمی استعماری قوتوں کو پسند نہیں آئیں اور ذوالفقار علی بھٹو ان کے دل سے اتر گیا۔ اس کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضیاء الحق کی شکل میں عالمی سامراجی قوتوں کو گھر کا چراغ مل گیا جس نے اپنی ہی ملک کی جمہوری حکومت کو آگ لگا کر ملک میں مطلق العنان راج قائم کر دیا۔ عوامی دباؤ اور ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت سے خائف ہو کر جنرل ضیاء الحق نے نظریہ ضرورت کے تحت اپنی من پسند عدالتوں سے اپنی خواہش کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ مگر اس سے پہلے عوام میں ایک ایسا نعرہ لگوایا کہ میں تو کچھ وقت کے لیے آیا ہوں۔ ملکی معاملات شریعت کے تابع کر کے اقتدار چھوڑ دوں گا۔ یہ مکار جنرل گیارہ برس تک ملک پر مسلط رہا تا آنکہ ایک فضائی حادثے میں راہی عدم ہوا۔ ملک کے دیگر دانشمند ادباء کی طرح جنوبی پنجاب سے بھی ضیاء الحق کے اس مارشل لاء کے خلاف ایک پر قوت آواز ابھری جو جاوید اختر بھٹی کی صورت میں ملکی فضاؤں میں گونجی :

> ''سر آپ لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ تماشائی نہیں چاہتے کہ آپ مزید اس کرسی پر تشریف رکھیں۔ اس لیے میں آپ کو معزول کرتا ہوں۔'' فوجی ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ اور اس نے کہا کہ میں نوے دن کے لیے آیا ہوں۔ فوج اقتدار میں نہیں رہنا چاہتی۔ بھٹو نے الیکشن میں دھاندلی کی ہے۔ اب دوبارہ الیکشن ہوں گے حکومت کو حقیقی نمائندوں کے سپرد کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے حکومت کی زیادہ خواہش نہیں۔ میں تو آپ کی خدمت کے لیے آیا ہوں۔'' نوے دن گزر گئے۔ الیکشن نہیں ہوئے۔ اسٹیج پر ایک عدالت لگتی ہے۔ بھٹو کو اس میں پیش کیا جاتا ہے۔ بھٹو خاموش ہے۔ وہ مجرم نہیں ہے۔ لیکن عدالت نے اس کے جرم اور سزا کو طے کر لیا ہے۔ عدالت فیصلہ سناتی ہے کہ ''اس شخص کو سزائے

موت دے دی جائے" دن گزرتے ہیں ایک اور عدالت، اس سے بڑی عدالت اپنا فیصلہ سناتی ہے۔ "اس شخص کو سزائے موت دے دی جائے۔ "62

پاکستان میں جتنی مرتبہ بھی مارشل لاء لگا ان تمام مواقع میں ایک قدر مشترک ضروری تھی، وہ قدر یہ تھی کہ اس وقت کی جمہوری حکومت اپنی مقبولیت کی پست ترین سطح پر تھی۔ جمہوریت کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے کئی مطلق العنان اور اقتدار کے رسیا فوجی آمر قسمت آزمائی کے لیے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو مارشل لاء کی وجوہات میں سب سے بڑی وجہ منتخب جمہوری حکومتوں کا عوامی مسائل کے حل میں ناکام ہو جانا ہے۔ جس کی بنا پر بعض مرتبہ عوام نے بذات خود مارشل لاء کے نفاذ کا خیر مقدم کیا بلکہ بعض مواقع پر تو مٹھائیاں بھی تقسیم کی گئیں۔ جب بھی مارشل لاء لگا تو بہت سے سیاسی لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لیے ملک کے مختلف کونوں میں جائے پناہ تلاش کرنے کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ بعض نے تو اپنے آپ کو ملکی سرحدوں سے باہر دوسرے ممالک کی گود میں محفوظ سمجھا۔ مگر ان میں ایک ایسا جی دار جمہوریت اور سیاسی رہنما بھی تھا جس نے فوجی آمر کے مدمقابل سر اٹھائے رکھا لیکن اس کے سامنے سر جھکانے کی تذلیل برداشت نہ کی اور ملکی بقاء کے لیے اپنی جان تک قربان کر ڈالی۔ وہ پہلا شخص تھا کہ جس نے ڈکٹیٹروں کے اس بپھرے ہوئے سمندر میں خنجر کی طرح خود کو گھونپ دیا۔ انوار احمد نے اس نڈر اور جرات مند رہنما کا طرز عمل اپنے افسانہ "ایک ہی کہانی" میں علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں سمندر کی طوفانی لہروں سے مراد مارشل لاء ڈکٹیٹر کا قہر و غضب ہے جو اپنے سامنے کھڑے ہونے والے ہر حیثیت کے لوگوں کو دھڑ دھڑ اڑاتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں لوگ سے مراد عمومی سیاست دان ہیں جو اپنے لیے گوشہ ممانیت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ سمندر کے سینے میں اترنے والے خنجر سے مراد وہ نظریات پر جان نچھاور کرنے والا سیاست دان ہے جس نے اپنی جان دینا تو قبول کر لی مگر کسی ظالم جابر مارشل لاء ڈکٹیٹر کے سامنے سر نہ جھکایا۔ ظلم و جبر کے اس تاریک دور میں بھی اس نے اپنے لہو سے اجالا پھیلانے کی جدوجہد کی۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

"ادھر نصف شب کے اسرار سے کف آلودہ ہو کر سمندر کی طوفانی لہریں آس پاس کی بستیوں کو دھڑا دھڑ نگل رہی تھیں، گھاس پھونس کی جھونپڑیاں سمندر کے غیظ کا لقمہ بن رہی تھیں اور لوگ تھے کہ ساحل کو محفوظ جان کر اپنے لیے خندقیں اور قبریں کھود رہے تھے اور ادھر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کنارے پر جان دینے کی بجائے سمندر کے سینے میں خنجر کی طرح اتر جائے گا اس کے مدمقابل رات بھی تھی سمندر بھی اور ناعاقبت اندیش ساتھی بھی، رات سمندر کی لہر لہر کو اس کی بستی کے، ہر مکان سے بلند دکھا رہی تھی اور اپنے سناٹے کو ایسے کڑاکے میں بدل چکی تھی جو ڈوبتے ہوؤں کے نوحوں پر

غالب تھا ایسے میں اس نے اپنے ارادے کو بے بس تنکے کی بجائے چپو بنانے کا فیصلہ کیا اور حوصلے کی کشتی کو بپھرے سمندر میں ڈال دیا۔"63

انوار احمد کی سیاسی و عسکری بصیرت کے بارے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں :

"مارشل لائی جبر کے خلاف لکھتے ہوئے ان کے لہجے کی تندی اور تلخی کچھ زیادہ ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں محض طنز سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن بسا اوقات زبان و محاورہ خوفناک حد تک اکبرہوا نظر آتا ہے۔"64

زن، زر اور زمین انسان کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں لیکن اقتدار کی ہوس اور طاقت کا نشہ بھی انسان کی فطری کمزوریوں میں شامل ہے۔ جس شخص کو اقتدار کی لت لگ جائے وہ حکومت یا اقتدار کے لیے کسی بھی حد تک گر جاتا ہے۔ سیاسی طالع آزماؤں نے تو اقتدار کے لیے جو کیا سو کیا مگر فوجی ڈکٹیٹروں نے بھی اقتدار کی حرص میں انتہائی اوچھے ہتھکنڈے آزمائے اور وہ بھی ایسے کہ انسانیت شرما جائے۔ پاکستان کے قیام سے لے کر تا حال غالب مدت ان فوجی ڈکٹیٹروں کا اقتدار رہا ہے۔ جنہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے ملک کے اقتدار پر عارضی قبضہ جمایا مگر سال ہا سال اقتدار سے چمٹے رہے۔ یہ اقتدار کی مسند پر قابض رہنے کے لیے مختلف لبادے اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کا اقتدار مطلق لعنانی کی ایک بھیانک صورت ہوتا ہے لیکن یہ اپنے اقتدار کو سیاسی تڑکہ دینے کے لیے مختلف بکاؤ سیاست دان مہیا کر لیتے ہیں جو فوجی ڈکٹیٹروں کو ملک و قوم کے حق میں فائدہ مند ثابت کرتے رہتے ہیں۔ یہ سیاست دان مارشل لاء کی گود میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ فوج ڈکٹیٹر بظاہر اپنے ادارے کے سربراہ کے طور پر اپنے دائرہ کار میں رہ کر فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر پس پردہ سیاسی حکومتوں سے ان کا گہرا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ ان سیاسی حکومتوں کو مختلف ناجائز ذرائع سے خود ہی معرض وجود میں لاتے ہیں۔ اس سیاسی حکومت کے درپردہ اصل حکمران یہ خود ہی ہوتے ہیں۔ یہ آمریت کی بدترین مثال ہے۔ یہ سیاسی حکمران جب تک ان کے اشاروں کی کٹھ پتلی بنے رہیں تب تک حکومت کا وجود برقرار رہتا ہے مگر جیسے ہی سیاسی حکمران اپنی سیاسی اور اقتدار کی طاقت دکھانا چاہیں تو ان مارشل لاء ڈکٹیٹروں کو انتہائی ناگوار گزرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ سیاست دان ان کے دل سے اتر جاتے ہیں اور سیاسی حکومت کا دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ ان مطلق العنان مارشل لاء آمروں کو اقتدار کی مسند پہ براجمان کرنے کے لیے نئے سیاست دان مہیا ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے مفادات اور ہدایات کے مطابق حکومتی فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ مارشل لاء ڈکٹیٹر بعض اوقات ملک و قوم کی سالمیت کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان اسی آمریت کی بدترین مثال ہے۔ جاوید اختر بھٹی نے مارشل لاء ڈکٹیٹروں کے اسی طرز عمل کا راز طشت از بام کرتے ہوئے اپنے افسانہ "فضل دین کا موبائل فون" میں علامتی انداز اختیار کیا۔ اس میں وہ فضل دین کو مارشل لاء ڈکٹیٹر کے روپ میں پیش کرتے ہیں جو مارشل لاء کے علاہ کوئی

اور بات کرنا جانتا ہی نہیں۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے موقع پر وہ اپنی اولاد پر حکم نامہ جاری کرتا ہے کہ میرے شوق یا حکم کو پورا کرو ورنہ گھر سے نکل جاؤ۔ میں یہ گھر بیچنے لگا ہوں۔ یہاں فضل دین کا کردار اور فوجی ڈکٹیٹروں کا کردار یکساں دکھائی دیتا ہے۔ جو اپنے مفادات اور تحفظات کے لیے ملک و قوم کا سودہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

> ''اس نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ ''یہ مکان خالی کر دو اپنے لیے کرایے پر کوئی مکان لے لو۔'' دونوں بیٹے حیرت سے باپ کی شکل دیکھنے لگے اور اپنی آنکھیں پورے طور پر کھول کر پوچھا۔ ''کیوں ابا؟'' ''میں کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔''۔۔۔ ''کون سا کاروبار؟''۔'' فضل دین تو کیسی باتیں کرتا ہے تیرے بیٹے پوتے کہاں جائیں گے۔۔۔ بہت کوشش کی گئی کہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر لے۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ کہ پنچایت ایک نیا رخ اختیار کر گئی۔ ایک سیانے آدمی نے جو کہ اس کے بڑے بیٹے کا ماموں سسر تھا۔ اس نے اپنی جیب سے سات آٹھ ہزار روپے کا موبائل فون نکال کر فضل دین کے ہاتھ پر رکھ رہا۔ ایک بچے کی طرح اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور نہ اپنے بیٹوں کے شرمندہ چہرے دکھے۔ اور وہ موبائل فون میں مگن ہو گیا۔ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ پنچایت کب برخاست ہو گئی۔''65

تقسیم کے بعد یعنی پاکستان کی دوسری دہائی سے ملک میں سیاسی عدم استحکام، کمزور سیاسی حکومتیں ان طالع آزما ڈکٹیٹروں کو اقتدار پر جھپٹنے کی دعوت دیتی آئی ہیں۔ سرکاری ادیبوں کے ساتھ ساتھ ملک میں آزادانہ فکر کے حامل شعرا و ادباء کی کمی نہیں تھی، جنھوں نے ان غاصب حکمرانوں کے خلاف بہترین مزاحمت کی۔ یہ مزاحمت مطلق العنانیت کے ان دیووں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور آزاد خیال مزاحمت کار ادیبوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ شعراء، ادباء، صحافی حضرات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو محض اس بنا پر سرِدار لٹکا دیا گیا یا غداری کے الزام کے تحت پابند سلاسل کر کے ان کی آواز یا الفاظ پر قدغنیں لگائی گئیں۔ کیونکہ وہ ان بے حس ڈکٹیٹروں کی پالیسیوں کے خلاف کھل کر تنقید کرتے تھے۔ ان کو یہ تنقید بری طرح کھلتی تھی اور یہی جرم ان ڈکٹیٹروں کے مخالفین کا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔ تمام مظالم کے باوجود ان مزاحمت کاروں نے طرح طرح کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کیا ۔ عوام میں ان مارشل لاء ڈکٹیٹروں کے خلاف شعور بیدار کرنے کی ہر کوشش کی۔ جنوبی پنجاب سے بھی ان فوجی ڈکٹیٹروں کے خلاف کئی منظم آوازیں بلند ہوئیں، اس خطے کے ادباء بھی مزاحمت کے اس عمل میں ملک کے دوسرے ادباء کے مقابلے میں پیچھے نہ رہے۔ یہاں کے اردو افسانوی ادب میں مارشل لاء کے خلاف ایک طاقت ور آواز انوار احمد

کی تھی، جنہوں نے اپنے مخصوص انداز اور علامتی پیرائے میں مارشل لاء کے خلاف عوامی رائے عامہ بھرپور طریقے سے بے دار کرنے کی کوشش کی۔

"میرے ساتھ آؤ، ایک تاریک گوشے میں محض آواز کے سہارے ایک سہانا خواب بنایا گیا کہ جمہوریت کی بحالی ہی اس ملک میں وہ سماجی عدل لاسکتی ہے، جو ہم سب کی آرزو ہے۔ سربکف مجاہد تو حاکم اور اس کے ساتھیوں کو اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں، ہم صرف اپنے نصب العین کے حق میں پمفلٹ لکھیں، سیاسی لیڈر کی فکری تیاری میں کردار ادا کریں، مزدور انجمنوں سے اپنا رابطہ بڑھائیں اور عوامی سطح پر یاسیت اور خوف کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کریں۔"66

عوام کے جمہوری اور بنیادی حقوق کا سب سے زیادہ استیصال مارشل لاء ڈکٹیٹروں نے کیا۔ جنہوں نے ملکی عوام پر اپنا تسلط اور دباؤ برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے، جمہوریت پسند سیاست دانوں کو تختہ دار پر لٹکایا۔ عوامی آواز کو بزور طاقت دبا دینا، حق گو اور بے باک شعراء و ادباء کے ساتھ نڈر صحافیوں کی زبان بندی اور اسی طرح کے خوف ناک ہتھکنڈے اپنائے۔ ان جابر حکمرانوں نے شاید یہ سوچ رکھا تھا کہ ان کے مظالم سے متاثر ہو کر حق گو آوازیں پاتال میں چلی جائیں گیں، مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ دنیا میں ایسے بھی حق کے علمبردار موجود ہیں جو سر دار بھی کلمۂ حق کہنے سے گریز نہیں کرتے۔

حوالہ جات

۱۔ الحق، شان۔فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقدرہ قومی زبان، طبع سوم، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸۔

۲۔ سرہندی، وارث۔جامع علمی اردو لغت، لاہور: علمی کتاب خانہ، طبع سوم، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۶۔

۳۔ مولوی، سید احمد۔فرہنگ آصفیہ، نئی دہلی: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۔

۴۔ جالبی، جمیل۔قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدر قومی زبان، طبع اول ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۵۱۔

۵۔ جنکسن، ایڈورڈ۔قومی، عبدال۔تاریخ وسیاست، دہلی: دار لطبع عثمانیہ، ص ا۔

6 Oxford Dictionary of England , 2nd Edition , London: Oxford University Press, 1998.

7 Aristole , Politics, what is polities, man is by a nature a political animal, page 3 , 2014 , Newyork, America.

۸۔ السندی، ابی الحسن۔صیح البخاری، کراچی: قدیمی کتب خانہ، ۱۹۶۱ء، ص ۴۹۱۔

۹۔ ترین، روبینہ۔ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیا کرام کا حصہ، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۔

10 South Punjab_Neglected and Politieized by Muhammad HuzaifaElahi on Apr 4, 2019, the MeGill international Review.

۱۱۔ جہانگیر، تحسین۔حقوق انسان، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۳۔

۱۲۔ اختر، جاوید۔چاند کے زخم، ملتان: پاکیزہ پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱ء، ص ۹۷۔

۱۳۔ نوشین، دردانہ۔ریگ ماہی، لاہور: الحمد پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۴۲۔

۱۴۔ اعجاز، احمد۔کہانی مجھے تلاش کرتی ہے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۹۷۔

۱۵۔ نوشین، دردانہ۔ریگ ماہی، لاہور: الحمد پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۳۳۶۔

۱۶۔ نوشین، دردانہ۔ریت میں ناؤ، اسلام آباد: پواب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۵۷۔

17 Mir Balakhshermazri, South Punjab __Neglected and politicized By Muhammd HazaifaElahi on Apr 4, 2019 at the McGill international Review.

۱۸۔ نوشین، دردانہ۔ ریگ ماہی، لاہور: الحمد پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷۳۔

۱۹۔ بابر، احمد سجاد۔ ''الگ ماہی ایک طلساماتی شاہکار'' مشمولہ نوائے وقت، روزنامہ۔ ملتان: ۳۱ اگست ۲۰۱۶، ص ۱۴

۲۰۔ حفیظ، محمد۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۶۱۔

۲۱۔ تنہا، علی۔ الٹے رخ کا دریا۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء ص ۱۶۵۔

۲۲۔ حفیظ، محمد۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۷۸۔

۲۳۔ احمد، انوار۔ ایک ہی کہانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۰۔

۲۴۔ تنہا، علی۔ سورج کے سب لوگ، ملتان: سنجوک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء ص ۱۵۲۔

۲۵۔ قاضی، راشدہ۔ پہلی سی محبت، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۶۷۔

۲۶۔ حیدر، نجیب۔ فلیپ ۳۶ گھنٹوں میں سے ۱۵ منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۔

۲۷۔ احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۴۰۔

۲۸۔ نعیم، شوکت۔ نتائج فکر، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴۔

۲۹۔ احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۶۹۔

30 http//www. websters...onlive...dictionary org/ definition/ freedomof expression.

۳۱۔ رسل، برٹرینڈ۔ رسل کے مضامین، ص ۷۷۔ س ن۔

۳۲۔ قاضی، راشدہ۔ حرف اور ہندسہ۔ لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۲۰ء، ص ۶۸۔

۳۳۔ اختر، جاوید۔ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۵۱۔

۳۴۔ تنہا، علی۔ الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء، ص ۳۵۔

35 Marlin, Randal propaganda and the ethics of persuasion , Board view press(p. 116---127)

۳۶۔ احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۴۔

۳۷۔ حفیظ، خان۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۵۵۔

۳۸۔ اختر، جاوید۔ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۴۷۔

۳۹۔ تنہا، علی۔ سفید چوہے، غیر مطبوعہ، ص ۳۔

۴۰۔ علی، مبارک۔ تاریخ اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، ص ۱۹۸۔

۴۱۔ تنہا، علی۔ الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء، ص ۱۰۱۔

۴۲۔ فیروزالدین۔ فیروز اللغات اردو، لاہور: فیروز سنز، ص ۴۷۲۔

۴۳۔ بدر، جہانگیر۔ جمہوریت کا ارتقاء، لاہور: اعزازالدین ٹی۔ بی۔ ایم پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۶۶۔

۴۴۔ اعجاز، احمد۔ کہانی مجھے تلاش کرتی ہے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۳۹۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۴۶۔ احمد، اعجاز۔ فلیپ، کہانی مجھے تلاش کرتی ہے، لاہور: مثال پبلشنگ، ۲۰۰۵ء

۴۷۔ حفیظ، محمد۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۴۳۔

۴۸۔ علی، تنہا۔ الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء، ص ۱۵۹۔

۴۹۔ علی، مبارک۔ تاریخ اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۱۔

۵۰۔ تنہا، علی۔ بھول کی گھنٹیاں، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۴۔

۵۱۔ قاضی، راشدہ۔ حرف اور ہندسہ۔ لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۲۰ء، ص ۲۱۔

۵۲۔ احمد، انوار۔ عاشقوں کے مکتوب، اسلام آباد: اوشال پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۲۲ء، ص ۱۷۔

۵۳۔ اختر، جاوید۔ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۵۴۔

54 https://dunya.com.pk/india. Php/khursheed---nadeem/2019-10-05.

۵۵۔ علی، مبارک۔ تاریخ اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، ص ۱۷۵۔

۵۶۔ علی، لیاقت۔جھوٹے آدمی کے اعترافات۔ملتان: بیکن بکس،۲۰۱۸ء، ص ۱۸۲۔

۵۷۔ اختر، جاوید۔رہی ذات،لاہور: قومی پریس،۲۰۰۱ء، ص ۱۱۴۔

۵۸۔ زائرنگ، لارنس۔ مترجم یوسف اعوان۔ پاکستان کا سیاسی بحران، لاہور: وین گارڈ بکس لمیٹڈ۔ ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱۔

۵۹۔ احمد، غفور۔پھر مارشل لا آگیا۔لاہور: جنگ پبلشرز،۱۹۸۸، ص ۱۶۔

۶۰۔ اختر، جاوید۔رہی ذات،لاہور: قومی پریس،۲۰۰۱ء، ص ۱۱۶۔

۶۱۔ تنہا، علی۔الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۲۰ء، ص ۲۱۔

۶۲۔ اختر، جاوید۔رہی ذات،لاہور: قومی پریس،۲۰۰۱ء، ص ۱۲۲۔

۶۳۔ احمد، انوار۔ایک ہی کہانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء، ص ۴۳۔

۶۴۔ انجم، شفیق۔اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)، اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۸ء، ص ۶۸۵۔

۶۵۔ اختر، جاوید۔سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن، ملتان: قندیل پبلشرز،۲۰۱۶ء، ص ۳۳۔

۶۶۔ احمد، انوار۔آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵۔

باب سوم

جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگار اور سماجی و معاشی مزاحمتی عناصر

الف: سماجی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ نگاروں کا تجزیہ

ب: معاشی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

انسان کے اجتماعی طریقہ زندگی، طرز بود و باش اور اندازِ حیات کو سماج کا نام دیا جاتا ہے۔ جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی مختلف نوعیت کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ جغرافیائی حد بندیوں کے ساتھ سماجی اصول بھی بدلتے رہتے ہیں۔

رائٹ(Wright)کے مطابق:

> "Society is not a group of people it is the system of relationship that exists between the individuals of the group."(1)

بقول غلام رسول:

> "معاشرہ یا سماج ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے۔ جو ہم خیالی کو پسند کریں اور اس بنا پر مشترکہ مفادات کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔"(۲)

بقول فیئر چائلڈ:

> "سماج انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد جن میں لازمی طور پر خود کی حفاظت یا پیٹ بھرنا، کپڑا پہننا اور خود کو اس میں شامل کرنا ہے اور ان سب چیزوں کو پورا کرنے میں مدد کرتا ہے۔"(۳)

پروفیسر خوشحال خٹک کے مطابق:

> "معاشرہ انسان کے مہذب اجتماع کا دوسرا نام ہے جس کی بنیادیں مخصوص اجتماعی اقدار پر استوار ہوتی ہیں اور پوری معاشرتی عمارت میں تاریخی پس منظر، معاشی افتاد سماجی بندھن وغیرہ اینٹ گارے کا کام دیتے ہیں۔"(۴)

سماج اپنے افراد کا آئینہ ہوتا ہے اور اس آئینے میں اس سماج کا ہر فرد اپنے کردار و عمل کی صحیح تصویر دیکھ سکتا ہے۔ اگر کسی سماج میں مثبت سماجی اقدار کا پاس نہ ہوگا یا سماج کے افراد کو ان کے درجے کے مطابق سہولتیں مہیا نہیں ہوں گیں تو وہاں مثبت تبدیلیاں رونما نہیں ہو سکتیں۔ سماج کے افراد مختلف پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر سب لوگ منفی رویوں کو چھوڑ کر اپنے شعبے اور منصب کو مثبت خطوط پر لے چلیں تو معاشرہ سنور سکتا ہے۔ سماج میں حکمران اپنا کردار رکھتے ہیں وہ اگر ریاستی معاملات بہتر انداز میں چلائیں تو یقیناً معاشرہ پُر امن ہوتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے پورے سماج پر

جاگیرداروں اور سرداروں کی بادشاہت ہے۔ پولیس، عدلیہ اور دیگر تمام شعبہ جات میں انہی کی من مانی ہے۔ جس معاشرے میں صاحب اقتدار یا بڑے بڑے عہدوں والے منفی رویوں کے حامل ہوں اور اپنی ذمہ داریاں بہتر طریقے سے انجام نہ دیں تو سماج میں منفی رجحانات کا اضافہ ہوتا ہے اور معاشرہ تباہی و بربادی کی تصویر بن جاتا ہے۔ جنوبی پنجاب پورا خطہ اس وقت ملک کا بدترین اور پسماندہ علاقہ ہے۔

قوانین اور اصلاحات کے ذریعے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ حقوق کی بہم رسائی کے لیے معاشیات بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ قوانین پر حقوق کا اور معاشیات پر ادائیگی حقوق کا انحصار ہے۔

> "معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترقی کے کسی بھی تشریحی نظریے کو اپنے اندر معاشرے کے طبعی ماحول، سیاسی ڈھانچے، ترغیبات، تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیے نیز اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس، معاشرتی تبدیلیوں اور ارتکاز دولت کے بارے میں کیا رویہ ہے۔ (۵)"

مولوی فیروزالدین کے مطابق:

> "اقتصادیات کا وہ علم جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم سے بحث کی جاتی ہے علم معاشیات کہلاتا ہے۔"(۶)

معاشی نظام مضبوط ہونے سے افراد خوش حال ہوتے ہیں کسی بھی خطے کے معاشی نظام کی کمزوری اسے پست بلکہ تباہ کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے جنوبی پنجاب کا معاشی نظام قیام پاکستان سے تاحال ناقابل اعتبار ہے۔ ارباب اختیار خطے میں بہتر معاشی نظام کا کوئی مضبوط ڈھانچہ وجود میں نہ لا سکے۔ عوام کو غربت و افلاس اور ذلت و پستی کی زندگی گزارنے کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ ظلم و زیادتی، بھتہ خوری اور سودی نظام نے پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔ صنعتی لحاظ سے اس خطے کو جان بوجھ کر پیچھے رکھا گیا ہے۔ کارخانوں اور فیکٹریوں کا رخ ملک کے دیگر علاقوں کی طرف رکھا گیا ہے۔ اگر کچھ فیکٹریاں، کارخانے موجود ہیں تو ادھر علاقے کی مقامی آبادی کو صرف غلامی اور بیماریوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ بڑے عہدوں اور عالی مرتبہ دفاتر میں جنوبی پنجاب کے لوگوں کا کوئی حصہ نہیں۔

> "Industrial development enriches a community which is sound in its agricultural, its domestic and craft life and in its spiritual robustness."(7)

ترجمہ: صنعتی ترقی اسی معاشرے کی خوشحالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو۔

سیاستدانوں، جاگیرداروں کے غلبہ کی وجہ سے وسائل کا غیر منصفانہ استعمال اور کمزور معاشی نظام سے تعلیم، صحت کی درست سہولتیں میسر نہیں۔ جو چند فیکٹریاں، کارخانے موجود ہیں، مقامی پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار کا موقع ہی نہیں دیتے۔ آسامیاں تو صاحب اقتدار لوگ اپنی مرضی سے مک مکا کر کے لیتے ہیں۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف۔ سماجی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ انگاروں کا تجزیہ

ب۔ معاشی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

(الف) سماجی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ نگاروں کا تجزیہ

کوئی بھی سماج کسی ایک طرح کی صنف انسانی اور طبقات سے تشکیل نہیں پاتا۔ ہر سماج میں طرح طرح کے رویوں کے حامل انسان موجود ہوتے ہیں۔ اگر غالب اکثریت مثبت انسانی قدروں کی حامل افراد کی ہو تو وہ سماج نسبتاً پرسکون ہوتا ہے۔ اگر کسی سماج میں منفی کرداروں کا دخل بڑھ جائے تو وہ سماج عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ سماج میں جہاں سادہ فوج عوام ہوتی ہے وہاں عیار اور چال باز افراد کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ عوام الناس میں سیاسی پٹھو، چٹی دلال، چور، ڈاکو، اور افراد کو باہم لڑا کر مقدمے بازی میں الجھانے والے سازشی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں سرکاری افسران خصوصاً پولیس اور محکمہ مال میں ایسے چالاق افراد کی کثرت ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی اوپر کی کمائی کے لیے ایسے افراد تیار کر رکھے ہوتے ہیں جو مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کو گھیر کر ان کے پاس لاتے ہیں۔ جن سے یہ سرکاری اہل کاران کے معاملات حل کرنے کیلئے رشوت طلب کرتے ہیں۔ وہ لوگ ان اہلکاروں کے حکم کے مطابق مجبوراً عمل کرتے ہیں ورنہ معاملات حل ہونے کا نام بھی نہیں لیتے۔ رشوت کی روشنائی پڑتے ہی ان اہل کاروں کے قلم ان کی خواہش کے مطابق الفاظ تحریر کرنے لگتے ہیں۔ محکمہ مال میں بیٹھے اکثر پٹواری، قانون گو، تحصیل دار اور دیگر عملہ رشوت کی اس بہتی گنگا میں پورے کا پورا غوطہ زن ہے۔ پٹواری نچلے درجہ سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے عملہ کے لیے پیسہ اکٹھا کرنے کا مجاز ہوتا ہے، پھر یہ رقم تمام حصہ داروں میں درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔ اگر کبھی کوئی ایماندار افسر اس شعبہ میں آ جائے تو اسے مختلف الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ عیار اور منفی سیاسی لوگ مل کر اس افسر کے خلاف جھوٹے مقدمے دائر کرتے ہیں۔ معروف افسانہ نگار محمد حفیظ

خان نے اپنے افسانہ "ناز و بگھیلا" میں سماج کے درندوں کا کچا چٹھا کھولتے ہوئے ناز و بگھیلا کے روپ میں جنوبی پنجاب میں بد عنوان عناصر کے پر فریب معاملات کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ ناز و بگھیلا کو ایماندار افسر کے آنے پر جب ناکامی نظر آتی ہے تو اس افسر مہر جیون خان تحصیلدار کے خلاف اوچھے ہتھکنڈے بروئے کار لاتا ہے۔ اپنے پھیلائے ہوئے جال میں خود ایسا پھنستا ہے کہ پھر رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اقتباس دیکھئے:

> ''پہلے پہل تو ربوچشتی جیسے پھنے خان اور رشوت کے بحر بیکراں گرداوروں نے آنکھیں دکھائیں۔ مگر جب مہر جیون خان تحصیلدار نے اس کا نوٹس ہی نہ لیا تو تحصیل کے پٹواریوں سے اُس کے رویے کے خلاف ہڑتال کرادی ۔۔۔ اوپر تلے کی کئی گمنام درخواستیں۔ کچھ نہ بنا تو پرانے مقدمہ بازوں، حرام کے جنوں کو بھری عدالت میں تحصیلدار سے بھڑا دیا۔۔۔ اینٹی کرپشن کی تفتیش، ڈی سی کے چھاپے۔۔۔ تحصیلدار پر بہتان تھوپ دیا کہ یہ جھوٹی درخواست، صاحب نے اس وجہ سے اس کے خلاف گزروائی ہے کہ اس نے 'چٹی دلال' بننے سے انکار کر دیا تھا۔''(۸)

ہمیشہ ہر سماج میں بنائے گئے اصول و قوانین سب کے لیے برابر ہوتے ہیں لیکن جنوبی پنجاب میں امراء، جاگیرداروں، سرداروں اور متوسط و نچلے طبقے کے لیے علیحدہ ضابطے بنائے گئے ہیں۔ ان غیر مہذب، غیر متوازی حلقوں میں ظلم و جبر اور غیر مہذبانہ اصولوں کا سب سے زیادہ نشانہ خواتین بنتی ہیں۔ جن کیلئے ان علاقوں کے مردوں نے انوکھے وحشیانہ قاعدے مقرر کر رکھے ہیں۔ تمام حقوق اور مراعات صرف مردوں کا حق سمجھی جاتی ہیں۔ خواتین کو ان اصولوں کی خلاف ورزی پر بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات خواتین سے ان کی زندگی تک چھین لی جاتی ہے۔ ان مردوں کی بے بنیاد، بے ہودہ روایات نہ صرف انسانیت کے منافی ہوتی ہیں بلکہ خواتین کیلئے انتہائی مضر اور ان کے سماجی حقوق کا استحصال کرتی ہیں۔

غیرت کے نام پر بے گناہ، معصوم خواتین کو قتل و غارت گری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ ان علاقوں میں قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی ادا کرنے، ملکی قوانین کے مخلصانہ نفاذ کی بجائے جاگیرداروں، سرداروں کے جاہلانہ اصول و ضوابط کی پاسداری میں لگے رہتے ہیں۔ مظلوم کے ساتھ انصاف کی بجائے سرداروں کے غلام بنے رہتے ہیں۔ اداروں کے ذمہ داران اپنے قانون کی کتاب میں وہی کچھ درج کرتے ہیں جو وڈیروں کی زبان سے صادر ہوتا ہے۔ محمد حفیظ خان اپنے افسانہ ''غیرت''میں ان سنگ دلانہ، غیر مہذب اقدار کے حامل جاگیرداروں، اور ان کے اشارہ ابرو کے مطابق چلنے والے اہل کاروں کے چلن کو واضح کرتے ہیں۔ جہاں رکھی نامی نوجوان لڑکی جسے حکم ہوتا ہے کہ عورت ذات کو نہ گوشت کھانے کی اجازت ہے اور نہ جوتا پہننے کی۔ گوشت کھانے

کی غلطی رکھی کی جان لے لیتی ہے۔ رکھی کا بھائی اپنے دشمن سے بدلہ لینے کیلئے اپنی بہن رکھی پر بدکاری کاالزام لگا کر اس کو کلہاڑی کے وار سے قتل کر دیتا ہے اور دشمن حاتو کو بھی قتل کر کے بہن کی لاش کے پہلو میں لٹا دیتا ہے۔ علاقے کے تھانے کا محرر، قاتل بھائی ربنواز کے کہنے پر رپورٹ میں درج کرتا ہے۔ کہ ایک بھائی نے اپنی بہن کو آشنا کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر غیرت میں آکر قتل کر دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ربو نے رکھی کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ چھوڑا جہاں کلہاڑی کئی کئی انچ گوشت میں نہ اتری ہو۔ پھر اس نے رکھی کے تڑپتے جسم کو گھسیٹ کر حاتو کے ٹھنڈے لاشے کے برابر آلٹایا۔۔۔ کچھ دیر بعد مقامی تھانے کا محرر ایف آئی آر لکھ رہا تھا کہ ایک غیرت مند بھائی اپنی بہن اور اس کے آشنا کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور اچانک اشتعال میں آکر قتل کر دیا۔''(۹)

عورت ہو یا مرد دونوں ہی سماج کے اہم ستون ہیں۔ مرد اگر گھر کی کفالت کرتا ہے تو عورت نسل انسانی کو بڑھانے کا اور معاشرے کے لیے کار آمد افراد کی تربیت کا موثر ذریعہ ہے۔ افراد معاشرہ میں عورت انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عورت ہر رشتے، ہر پہلو سے محترم ہے۔ وہ روپ چاہے ماں کا ہو، بہن کا ہو، بیوی کا ہو یا بیٹی کا ہو۔ عورت قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ مگر جاہلیت کے آنگن میں پرورش پانے والے لوگ عورت کو تجارت کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کے جذبات واحساسات نہیں ہوتے وہ صرف بچے پیدا کرنے کی، ان کی شہوانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ جب اس سے دل بھر جائے تو چند پیسوں کے عوض اسے دوسروں کے بستر کی زینت بنا دیتے ہیں۔ عورت کی ذلت کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا۔

عورت کے اس سماجی و معاشرتی استحصال اور اس کو پیش آنے والے دردناک حالات کو حفیظ خان نے اپنے افسانہ ''لاہور جان'' میں بڑے حساس اور کاٹ دار انداز میں بیان کیا ہے کہ لاہور جان ایسی بدقسمت خاتون ہوتی ہے جسے سب سے پہلے اس کا باپ، بڑی عمر کے آدمی کو فروخت کر کے اس کے ارمانوں کا خون کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا شوہر اپنے گھر میں مختلف اذیتوں میں مبتلا رکھ کر اپنی ہوس پوری کر کے چند بچے پیدا کرنے کے بعد دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسی طرح مختلف ہاتھوں میں بکتی ہوئی آخر کار بازار طوائف جا پہنچتی ہے۔

تاریخ اسے ایک مرتبہ پھر اپنا بھیانک روپ دکھاتی ہے جب اُس کا پہلا شوہر اس کے بچوں کو فروخت کرنے شہر لاتا ہے۔ ممتا کی تڑپ اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان کے حقیقی باپ سے خرید لیتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس عورت کا اپنا بیٹا اپنی بہنوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ ناتواں عورت اپنی بیٹیوں کی عزت کی خاطر

خون آشام قاتل کا روپ دھار لیتی ہے اور معاشرے کے وحشی مردوں کی صورت میں موجود اپنے حقیقی بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اقتباس دیکھیئے:

> ''کوئلے کی کانوں کی بستی مکڑوال اگر لاہور جان کو معلوم ہوا کہ اسے ممریز خان خرید لایا ہے۔۔۔ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو شاید لاہور جان اپنی قسمت پر شاکر رہتی مگر ایک شام اس کے اندر کی عورت تڑپ گئی جب ممریز خان نے اسے دریائے سندھ کے پار سے آنے والے اجنبی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بچے اپنے ہاں رہنے دیے۔۔۔ وہ خنزیر کی اولاد، ایک اور عمر حیات کو اپنے گھر میں لے آیا، پشم جان اور منصب جان کا سودا کرنے۔۔۔ میں نے اسے بہت روکنے کی کوشش مگر وہ نہ رکا۔''(۱۰)

محمد حفیظ خان کی تخلیقی صلاحیت اور فکر کے بارے منشا یاد کہتے ہیں:

> ''حفیظ خان ایک راست فکر اور حقیقت پسند کہانی کار ہیں اور ایسے حقیقت نگار، جو اپنے مشاہدے اور تجربے کو کسی طرح کی ملاوٹ کے بغیر پوری سچائی اور جرأت کے ساتھ پیش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔۔۔ بے تکلف اور برجستہ انداز بیان اور نادر تشبیہات نے تحریر میں دلچسپی سے پڑھے جانے کی خوبی اور خوب صورتی پیدا کر دی ہے اسلوب کے اعتبار سے یہ سیدھی اور سچی کہانیاں ہیں اور اپنا ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔''(۱۱)

ایسے سماج میں کبھی سدھار نہیں آسکتا جہاں ہمدردی کے رویے موجود نہ ہوں۔ جنوبی پنجاب کے چند دولت مند لوگوں کے پاس مال وزر کے پہاڑ ہیں مگر فاقہ کشوں کی کفالت، مصائب میں گھرے افراد کی مدد اور درد کے ماروں کی دستگیری کے لیے ان کے خزانوں میں ایک ڈھیلا بھی نہیں۔ یہ اپنی دولت اپنی شاہ خرچیوں پر تو صرف کرتے ہیں مگر پسماندہ اور غریب طبقات کے لیے خرچ کرنے کی توفیق نہیں۔ ان کی نظر میں یہ مفلس، حسرت زدہ طبقہ حقیر و ذلیل ہوتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں ایسے صاحب ثروت افراد بھی موجود ہیں جو اپنی دولت کا تھوڑا سا حصہ اگر محتاجوں، ضرورت مندوں کی مدد کے لیے خرچ کر دیں تو معاشرے میں خوشحالی آسکتی ہے۔ یہ جاگیر دار، سرمایہ دار مفلس کی مدد کرنا تو در کنار ان کی محنت و مشقت کا پورا معاوضہ نہیں دیتے اگر دیتے بھی ہیں تو اس طرح پریشان کر کے کہ وقت پر اجرت نہ ملنے کے باعث ان مزدوروں کی نہ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں نہ ہی ان کے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ یہ بے حس طبقہ مزدوروں کا سخت معاشی استحصال کرتا ہے۔ غریب مزدور اس کے اپنی ہڈیاں جاں گسل مشقت میں پگھلاتا ہے کہ وہ اس معاوضے سے اپنے بچوں کو دو وقت نہ سہی ایک وقت تو کھانا کھلا پائے یا ان کی ضرورتیں پوری کرے لیکن احساس

انسانیت سے محروم دولت مند طبقہ اپنی عیش و عشرت میں گم ہونے کی وجہ سے ان کی مزدوری وقت پر ادا نہیں کرتا جس سے نادار مزدوروں اور ان کے بچوں کے تمام ارمان خاک میں مل جاتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں بے حس اور استحصالی رویوں کے حامل دولت مند طبقے کی روش کو احمد اعجاز نے اپنے افسانہ ''راستہ پانیوں میں جسم مٹی کا'' میں بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ایک غریب مزدور کی بیٹی جس نے اپنے کالج انتظامیہ کی طرف سے دیگر طلبہ کے ساتھ تفریح دورے پر جانا ہوتا ہے۔ نئے کپڑے خریدنے کے لیے باپ کہتا ہے کہ بیٹا جمعرات کو مزدوری ملے گی تو آپ کو خرید دوں گا۔ سلائی وغیرہ خود ہی کر لینا، لڑکی کا باپ جب ٹھیکیدار سے اپنی اجرت لینے جاتا ہے مزدوری نہیں ملتی کیونکہ ٹھیکیدار اپنی تفریحی مصروفیات میں مصروف ہو جاتا ہے۔ غریب بیچارہ اپنی اجرت سے محروم رہتا ہے ساتھ ہی بچی کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ماں سے بچی کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ وہ جہاں بطور نوکر کام کرتی ہے وہاں سے ایک سوٹ لے آتی ہے۔

تفریح کے دورے کے بعد واپسی پے بچی جب اپنی تصاویر ماں کو دکھاتی ہے تو اس کی ماں کہتی ہے یہی جو لڑکی تمہارے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے میں اس کی امی سے تمہارے لیے سوٹ مانگ آئی ہوں۔ یہ تو وہ لڑکی ہے جو میری میڈم صاحبہ کی بیٹی ہے۔ بچی اپنے دل میں انتہائی ندامت اور شرمندگی محسوس کرتی ہے کہ وہ جن کی اترن پہن کر ان کے سامنے اپنی عزت کا بھرم رکھ رہی تھی وہ عزت کا دامن تار تار ہو گیا، سارا بھرم ٹوٹ گیا۔

> ''اس جمعرات کو مجھے مزدوری کے ایک ہزار مل جائیں گے اس میں سے پانچ سو کا تم نیا سوٹ سلوا لینا اور باقی کے پیسوں سے گھر کا سودا سلف آجائے گا۔ جمعرات کو ماں کے ساتھ جا کر خرید لینا اور سینے میں تو تم ماہر ہو جمعہ کو تیار لینا۔ بوڑھے مزدور کی بات سے ماں بیٹی کا چہرہ کھل اٹھا۔۔۔ ٹھیکے دار کا انتظار کرتا رہا، نہ آیا تو اس کے گھر چلا گیا، گھر میں صرف نوکر تھا، اس نے بتایا کہ صاحب تو بچوں کو لے کر مری سیر کو گئے ہوئے ہیں، اتوار کو لوٹیں گے۔ ماں بیٹی کے چہرے بجھ گئے۔ بوڑھے مزدور کا چہرہ تو ازل سے بجھا ہوا تھا۔''(۱۲)

شرح خواندگی کم ہونے کے باوجود لوگ کردار و عمل میں مضبوط تھے۔ ایمانداری دیانت کے ساتھ اپنے امور سرانجام دیتے۔ سماج کا ہر طبقہ امانت دار اور فرض شناس تھا۔ رزق حلال ان کی اولین ترجیح تھی۔ فاقہ کشی کی رات تو بسر کر لیتے مگر اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالنے کے روادار نہ تھے۔ پھر شرح خواندگی بڑھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ سماج میں آ گئے مگر بے ایمانی، بدعنوانی اور جرائم کی شرح میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بڑے منصب پر براجمان بد عنوانیوں اور خرد برد کے معاملات میں ملوث ہیں۔ پورے پاکستان میں عمومی طور پر اور جنوبی پنجاب میں خصوصی طور پر

اکثر حکومتی اہلکار اپنے اپنے شعبہ جات میں منصب کا غلط استعمال کر کے سماج کے افراد کے لیے حکومت کی جانب سے دی گئی مراعات اور دیگر سہولیات کے نام پر مہیا ہونے والے فنڈز ہڑپ کر جاتے ہیں۔ تعلیم کے شعبہ میں ادارہ سربراہان، سکول، کالجز اور طلبہ کی تعلیمی سہولیات کے لیے جو فنڈز مہیا ہوتے ہیں وہ اعلیٰ عہدیداروں سے لے کر ادارہ سربراہ تک ہر ایک کی جیب میں حصہ چلا جاتا ہے۔ یوں طلبہ و طالبات اور سٹاف محروم رہتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں اداروں کے ایسے بددیانتی پر مبنی طرز عمل کو احمد اعجاز نے اپنے افسانہ ''کہانی کا موضوع'' میں ایک خاتون لیکچرار کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکچرار صاحبہ سرکاری کام سے دوسرے ادارے جاتی ہے لیکن اس کو آنے جانے کے لیے کوئی سہولت نہیں ملتی۔ تعلیم کے شعبہ میں جنوبی پنجاب کی عوام کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اقتباس دیکھیئے:

''گاڑی مضافات میں زنانے بھرتی اور پانی کے چھینٹے اڑاتی جارہی تھی کہ اچانک بریک لگانا پڑی، ایک خاتون ہاتھ ہلا ہلا کر رکنے کا اشارہ کر رہی تھی ۔۔۔ آج کل کالج سطح پر تقریری مقابلے ہو رہے ہیں اور میری ڈیوٹی بطور جج کے ہے یوں تین دن سے مسلسل دھکے کھا رہی ہوں، آج تو موسم کی وجہ سے ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے، یہ تو شکر ہے کہ آپ مل گئے ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا۔''(۱۴)

قانون وانصاف کی بالادستی کسی بھی سماج کی فلاح وبقا کی ضامن ہوتی ہے۔ کفر کا معاشرہ تو قائم رہ سکتا ہے مگر ظلم و ناانصافی سماج کو اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ جس سماج میں قانون وانصاف مہیا کرنے والے بدعنوان، ظالم و جابر ہوں وہ سماج کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے جب خود ہی قانون شکنی کے مرتکب ہوں تو وہاں زوال ہی ہو گا۔ مظلوم کو انصاف دینے کی بجائے الٹا اسے ہی ظلم کی چکی میں پیس دیا جاتا ہے۔

بالخصوص پولیس کا محکمہ قانون شکنی اور ظلم و ستم میں سب سے آگے ہے۔ اگر کہیں کوئی واردات ہو جائے تو اوّلاً وہاں اہلکار پہنچتے ہی نہیں، اگر پہنچ بھی جائیں تو اتنی دیرے سے کہ واردات کرنے والے باآسانی فرار ہو جاتے ہیں پھر تفتیش کے نام پر متاثرین کے ساتھ ہی انتہائی بہیمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اپنی جائز شکایات کے لیے پولیس والوں کو جب تک تگڑی رشوت نہ دی جائے تب تک اندراج مقدمہ نہیں ہوتا۔ کئی لوگوں کو رشوت نہ دینے یا محض شک کی بناء پر پولیس نے اپنی عقوبت گاہوں اس قدر بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا کہ وہ جان کی بازی ہار گئے۔ پولیس اہلکاروں نے خودکشی کا ڈرامہ رچا کر خود کو محفوظ کر لیا۔ مظلوم اور ان کے ورثا تڑپتے، فریاد کرتے رہے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں نے خود ہی سماج دشمن غنڈہ عناصر کی پرورش کر رکھی ہے جو ان کے اشاروں پر مختلف خوفناک وارداتیں انجام دیتے ہیں، لوٹے ہوئے مال میں سے ان اہلکاروں کو حصہ بہم پہنچاتے ہیں۔ لیاقت علی اپنے افسانہ ''پرچھائیاں'' میں جنوبی پنجاب کے سماج کی عکاسی بیان کی ہے کہ ایک شخص نے دیکھا کہ پولیس ناکہ لگا ہوا ہے

اور ایک جواں سال طالب علم کی نعش خون میں لت پت پڑی ہے۔ پولیس کے مطابق اس کو روکنے کا اشارہ کیا مگر نہ رکا، اہلکاروں کی گولیاں لگنے سے جان گنوا بیٹھا۔ بعد میں پولیس نے یہ الزام لگایا کہ یہ جوان دہشت گردوں کا سرغنہ تھا، آج ہتھے چڑھا تو پولیس نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ اقتباس دیکھیئے:

> ''ایک نوجوان خون میں لت پت سڑک پر پڑا تھا۔ قریب ہی کچھ پولیس والے کھڑے وائرلیس پر کسی کو اطلاع دے رہے تھے میں آگے بڑھا اور قریب کھڑے لوگوں سے معلوم ہوا کہ نوجوان کو رکنے کا اشارہ کیا گیا تھا مگر اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی، جس پر پولیس نے فائر کھول دیا۔ پولیس والوں کا اصرار تھا کہ روکنے پر نوجوان نے اُن پر فائرنگ کی اور یوں مقابلے میں مارا گیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ کوئی عام نوجوان نہیں تھا بلکہ دہشت گردوں کا اہم سرغنہ تھا۔''(۱۴)

تعلیم اس کائنات کا سب سے عظیم جوہر ہے۔ اسی جوہر کے تحت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کے سامنے سر بسجود ہوں۔ علم ہی نے بنی نوع انسان کو تمام مخلوقات پر تکریم بخشی۔ جس سماج میں تعلیم کا معیار جتنا ہوتا ہے وہ اتنا ہی باشعور اخلاقیات، ایجادات اور حسن معاشرت میں عظیم ہوتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں بڑی بڑی درسگاہیں جہاں طلبا و طالبات کی کثیر تعداد موجود ہے وہاں طلبہ کے لیے بہت سی مشکلات ہیں۔ اساتذہ اپنے منظورِ نظر طلباء و طالبات کو سرِ فہرست رکھنے کیلئے مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ مختلف تعلیمی اداروں والے اپنے ادارے کو شہرت دینے کیلئے امتحانات پر مامور اہل کاروں کو رشوت کے طور پر روپوں کی بوریاں پیش کرتے ہیں۔ ایسے میں ان طلبا و طالبات کا حق مارا جاتا ہے جو محنت اور دیانتداری سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کالجوں اور جامعات میں اساتذہ و طالبات کو مختلف حوالوں سے بلیک میل کرتے ہیں۔ جامعات میں سمسٹر سسٹم ہوتا ہے، جو اساتذہ پڑھاتے ہیں وہی پیپر چیک کرتے ہیں۔ اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے وہ طلبہ کو مختلف طریقوں سے اپنے دباؤ میں رکھتے ہیں۔ طالبات کا بہت زیادہ جذباتی اور جنسی استحصال معمول کی بات ہے۔ بعض بدکردار اساتذہ طالبات کو اس شرط پر بہترین نمبر دیتے ہیں کہ وہ ان کی شہوانی خواہشات پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ لیاقت علی نے اپنے افسانہ ''رول نمبر ۱۰'' میں جنوبی پنجاب کے تعلیمی اداروں، اساتذہ کے طرز عمل کی قلعی کھولی ہے، جو طالبات کو اپنی شہوانی تسکین کا ذریعہ بنائے رکھتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

> ''اب مجھے آنکھیں دکھاتی اور ڈراتی ہے کہ اگر خواہ مخواہ مجھے کال کرنے یا بات کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ مجھ میں خود اتنی قابلیت ہے کہ میں ہر امتحان میں بخوبی پاس ہو سکتی ہوں۔ اچھا تو یہ معاملہ ہے۔۔۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں نے ان

کے کندھے پر ہاتھ جماتے ہوئے پوچھا۔ یہ سمسٹر ری پیٹ ہونا چاہیے انہوں نے اس بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، پہلی بار وہ مجھے ایک بالکل مختلف آدمی دکھائی دیئے۔ ان کی نظروں میں التجا تھی، خواہش یا دھمکی، میں کچھ فیصلہ نہ کر پایا، میں نے رسمی طور پر سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا: آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"(۱۵)

سماج کی تعلیم و ترقی میں تعلیمی اداروں کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر یہ تعلیمی ادارے اپنے فرائض منصبی درست انداز میں ادا کرتے ہوئے تعلیم و تربیت اور باشعور افراد مہیا کریں تو لا محالا سماج عظیم سے عظیم صورت میں ڈھل جائے گا۔ دور جدید تعلیمی ترقی بام عروج پر ہے، لیکن جنوبی پنجاب میں اکثر تعلیمی درسگاہوں کا ماحول اخلاقی انحطاط کا شکار ہے۔ اخلاقی کم مائیگی کا شکار معلمین، طلبا کا خوفناک استحصال کرتے ہیں۔ مختلف سیاسی، مذہبی، متشدد تنظیمیں ان جامعات کے طلبا کی کثیر تعداد کو اپنا آلہ کار بنا کر درسگاہوں کے ماحول کو ابتر کیے ہوئے ہیں۔ یہ تنظیمیں اس قدر طاقت ور اور سفاک ہیں کہ جامعات کی انتظامیہ بھی ان سے خوف کھاتی ہے۔ بعض جامعات کے سربراہان اور اساتذہ خود بھی ان تنظیمیوں کے کرتادھرتایان کے مفادات کے محافظ کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہ متشدد جب چاہیں طلبا کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ خاص طور پر طالبات انتہائی جبر اور مشکلات کا سامنا کرتی ہیں۔ طالبات کو ذہنی و جسمانی تشدد کے علاوہ ان کی عزت کو بھی داغ دار کرتے ہیں۔ ان تنظیموں کے خلاف مزاحمت کرنے والے طلبا و طالبات کی کہیں پر شنوائی نہیں ہوتی۔ راشد ہ قاضی جنوبی پنجاب کی جامعات میں سیاسی جماعتوں کے غنڈہ عناصر کے کردار کو بے نقاب کرتے ہوئے اپنے افسانہ "جگنو اور ستارہ" میں تحریر کرتی ہیں۔

"نہیں پکڑا تو کوئی نہیں گیا۔ لیکن جتنی لڑکیاں زخمی ہوئی یا روندی گئیں۔ ان سب کا موقف ہے کہ یہ کارنامہ اُسی متشدد پارٹی کا ہے۔ ان کی جماعت کی اپنی لڑکیاں ان سے متنفر ہو گئی ہیں۔ آج صبح وی سی آفس لڑکیوں کی نعرہ بازی سے ہل رہا تھا۔ وی سی صاحب باہر آئے تو لڑکیوں نے بھرپور احتجاج کیا۔۔۔ آج اگر وی سی صاحب کی بیٹی پہ تہمت لگی ہوتی۔ تو میں دیکھتی کہ وہ کس طرح A.C روم میں آرام فرماتے۔ ہمارے سروں سے چادریں چھیننے والے جب بظاہر ہمیں بہنیں کہتے ہیں تو انہیں حیا نہیں آتی۔ اور سنا ہے کہ وی سی صاحب نے فرمایا ہے کہ کمیٹی بٹھائیں گے۔ ارے جائیں۔ منصف بھی وہی مجرم بھی وہی۔ کیوں جعلی کٹہرے سجاتے ہو۔ اور نقلی رپورٹس بناتے ہو۔"(۱۶)

اے۔کے۔ سی۔ اوٹاوے مندرجہ بالا خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تعلیم ایک سماجی سرگرمی ہے اور اس کے مقاصد اور طریق ہائے کار اس سماج کی نوعیت پر مبنی ہوتے ہیں جن میں وہ جاری ہوتی ہے۔۔۔ جہاں تک فرد کی تعلیم کا تعلق ہے، یہ علم شخصیت کی نشوونما پر سماجی زندگی اور سماجی علائق کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔"(۱۷)

ریاست رعایا کی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ جو اپنی اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت اور اخلاق سازی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ عوام کی بنیادی ضروریات صحت، تعلیم، انصاف اور روزگار دینا حکومت کا فرض ہے۔ جنوبی پنجاب میں یہ تمام سہولیات انتہائی بدحالی کی کیفیت میں ہیں۔ حکمران اپنی سیاست چمکانے کیلئے سیاسی حریفوں کو اپنی چال بازیوں سے دیوار سے لگانے میں مصروف ہیں عوامی مسائل کے حل سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اپنے تعیشات کیلئے ریاستی خزانے کو بے دردی سے لوٹ رہے ہیں۔ عوام الناس کا حق صرف موت کی طرح منہ کھولے بھیانک مسائل سے دوچار ہونا ہے۔

جنوبی پنجاب میں تعلیم کا انتہائی فقدان ہے۔ تعلیمی اداروں کی عمارات ٹوٹی پھوٹی، طلبہ کیلئے فرنیچر اور تعداد کے مطابق اساتذہ کی فراہمی بعض اداروں میں مخصوص مضامین کے اساتذہ ہی میسر نہیں ہیں۔ اساتذہ کی آسامیاں خالی پڑی ہیں، ان اداروں میں طلبہ و طالبات اپنی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر پاتے۔ جنوبی پنجاب میں تعلیمی ضروریات اور مشکلات کے حوالے سے دردانہ نوشین خان اپنے افسانہ "بجوگ" میں حقائق پر مبنی صورتحال کو اپنے افسانوں میں یوں اجاگر کیا۔

"بہت ورک لوڈ ہے۔ ہائر لیول پر اردو کی دو مزید ٹیچرز ہونا چاہئیں۔ آپ مزید کی بات کرتی ہیں سارا سال فزکس کا پیریڈ خالی رہا ہے۔ تین ماہ سے میتھس کی ٹیچر نہیں ہے۔ سائنس کے بچے رُل گئے ہیں۔ مسز جمال کلاس انچارج ہونے کے ناطے اپنا رونا لے بیٹھیں۔۔۔ ناظم آباد کی پرنسپل بھی میٹنگ پر سٹاف کی کمی کا دکھڑا سنا رہی تھیں۔ تعلیم یافتہ نوجوان مارے مارے پھرتے ہیں۔ نئی پوسٹیں نہیں نکالنی تو کم از خالی تو پُر کردیں۔"(۱۸)

خواتین کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک رکھا گیا۔ کبھی جذباتی استحصال کیا گیا تو کبھی انہیں حق وراثت سے محروم کیا گیا۔ عورت ہر دور میں مظلوم و مجبور رہی ہے۔ اس خطے کا جاگیر دار طبقہ اپنے خاندان کی بیٹیوں کو محض اس لیے حق نکاح سے محروم رکھتا ہے کہ اگر ان کی شادی کر دی گئی تو موروثی جائیداد دوسروں کے پاس چلی جائے گی۔ بعض نام نہاد مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے سجادگان ان جاگیرداروں سے کچھ کم نہیں۔ یہ مذہب کا لبادہ اوڑھے گمراہ پیر اپنے

خاندان کی خواتین کو محض اس لیے شادی نہیں کرنے دیتے کہ کوئی دوسرا ان کے آستانہ، مذہبی دکان کا دعوے دار نہ بن جائے۔ ایسے گھرانوں میں خواتین کی شادی زبردستی قرآن پاک سے کر دی جاتی ہے جو کہ خلاف شریعت، غیر فطری عمل ہے۔ پیر صاحبان نے اپنے گھر کی خواتین کیلئے من گھڑت باتیں مشہور کر رکھی ہوئی ہوتی ہیں کہ بی بی جی روحانیت کی اس منزل پے ہیں جہاں وہ شادی کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ ان آستانوں کی خواتین بے شرم لوگوں کے مظالم کا شکار ہو کر فطرت کی تمام تر رنگینیوں سے محروم رہتی ہیں۔ کہیں یہ ظالمانہ پابندیاں ان خاندانوں کی خواتین میں بغاوت کا سبب بن جاتی ہیں۔ یہ خواتین گھر سے بھاگ کر کبھی تو کسی شریف النفس آدمی کے ساتھ نکاح کر کے باعزت اور آزاد زندگی بسر کرتی ہیں مگر کبھی وہ اپنی عزت کی جمع پونجی بھی ہار جاتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی خاتون بن بیاہی ماں بن جائے تو مذہب وولایت کے نام نہاد اپنی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے ان خواتین کی جان تک لے لیتے ہیں۔

یوں یہ خواتین اپنے گناہ کے ساتھ قبر میں جا سوتی ہیں۔ مذہبی بڑبوتے اس کا مزار بنا کر کمائی کی ایک اور دکان کھول لیتے ہیں۔ ان کی عزت کا بھرم بھی رہ جاتا ہے اور آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ راشد حقاضی نے جنوبی پنجاب کے مکار مذہبی پنڈتوں کے اس کردار کو اپنے افسانہ ''گرد میں لپٹی کہانی'' میں بڑے فصیح و بلیغ انداز میں تحریر کیا ہے۔

> ''بی بی کی عدم موجودگی میں یہ ظاہر کیا گیا کہ بی بی حج پر تشریف لے گئی ہیں کچھ عرصہ یاد الٰہی میں گزاریں گی۔ جب مدنی سرکار رخصت عطا فرمائیں گے واپس تشریف لائیں گی۔ اب یہ کہا گیا کہ بی بی حضرت تشریف تو لا چکی ہیں لیکن کسی سے مل نہیں سکتیں کہ ابھی کچھ ریاضت باقی ہے کچھ مرحلے طے کرنے ہیں۔۔۔ ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں بی بی کو درگاہ عالیہ سے ذرا فاصلے پر دفنا دیا گیا اور یہ عہد کیا گیا کہ جلد ہی اس چاردیواری کو عالی شان مقبرے کی شکل دے دی جائے گی۔''(۱۹)

بقول ڈاکٹر مبارک علی:

> ''حکمران طبقے خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا حزب اختلاف انہی پیروں، سیاستدانوں اور جاگیرداروں کی اولاد قابض ہے۔۔۔ یہ جاگیردار، پیر اور سیاستدان کسی کام کے بغیر دولت میں کھیلتے ہیں۔ ان کی اس شان و شوکت کا بڑا عنصر اُن نذرانوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے مریدوں اور رعایا کی محنت سے وصول کرتے ہیں۔''(۲۰)

لاکھوں تعلیم یافتہ لوگ حصول روزگار کیلئے پریشان ہیں۔ سرکاری محکمے ہوں یا نجی ادارے ہر جگہ تو نوکری صرف اس کو ملتی ہے جو بھاری بھر کم رشوت دے یا کسی ایم پی اے، ایم این اے کی سفارش رکھتا ہو۔ سرکاری محکموں میں نچلے درجے کی ملازمت سے لے کر اعلیٰ درجے تک کی نوکری کی ایک مخصوص قیمت مقرر ہے۔ اگر پیسہ ہو تو قابلیت وصلاحیت نہیں دیکھی جائے گی فقط نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں نصیب بنا سکتی ہیں۔ اگر کوئی امیدوار نوکری کے لیے مطلوبہ رقم دے تو نوکری پکی ورنہ سرکاری نوکری کے بارے سوچ بھی نہ۔ جو لوگ اس طرح رقم خرچ کر کے نوکریاں حاصل کرتے ہیں تو وہ اس سے کئی گنا زیادہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کے ناجائز حربے جیسے بدعنوانی، رشوت وغیرہ سے مال بٹورتے ہیں۔ ہر محکمہ خصوصاً انکم ٹیکس کے شعبہ میں رشوت کا یہ چلن عام ہے۔ اعلیٰ آفیسرز نے لوگوں سے رشوت لینے کے لیے باقاعدہ طور پر ماتحت ملازمین کا ایک گروہ بنا رکھا ہے۔ یہ بدعنوان ملازمین اپنے آفیسرز کی آنکھ کا تارا ہوتے ہیں۔ جاوید اختر بھٹی سماج میں سرکاری اہلکاروں کے ان غیر مہذبانہ رویوں اور سماجی واخلاقی برائیوں کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے افسانہ ''تصویریں'' میں ایسے نوجوان کا واقعہ بیان کرتے ہیں جو رشوت کے زور پر نوکری/ ملازمت حاصل کرتا ہے پھر خود بھی مال بناتا ہے اور اعلیٰ احکام کو بھی رشوت سے مالا مال کرتا ہے۔

> ''یہ انٹرویو انکم ٹیکس کی افسری کے لئے تھا۔ آسامی ایک تھی اور امیدوار سو سے کچھ اوپر ہی تھے۔ تمام امیدواروں کے ہاتھ سندوں سے بھرے ہوئے تھے لیکن بشیر کے ایک ہاتھ میں سندیں اور دوسرے ہاتھ میں بہت سی تصویریں ظاہر ہے نوکری بشیر ہی کو ملنی تھی۔۔۔ بشیر ''ایماندار'' افسر تھا اپنے سے بڑے افسر کو اس کا پورا حصہ دیتا تھا، بشیر کی ''ایمانداری'' اس کے افسر کو پسند آئی اس لیے اس نے بشیر کی ترقی کر دی۔'' (۲۱)

اکثر سیاستدان صرف اور صرف مفاد کے بندے ہوتے ہیں اور اپنے مفادات کیلئے سماج کے چلتا پرزا قسم کے افراد کو مختلف مراعات دیتے ہیں۔ انہیں سماج میں معزز بنانے کے لیے مختلف پہلوؤں سے کام کرتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسے مذہبی لوگوں کا ہے جو فقط مذہبی لباس میں ملبوس ہوتا ہے۔ اس طبقے کو سماج میں جو عزت وعظمت ملتی ہے اس کی وجہ نام نہاد سیاستدانوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مذہب کا لبادہ اوڑھے یہ عناصر ان سیاستدانوں کا سماج میں مقام ومرتبہ بنانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کرتا ہے اور اپنے حلقہ ارادت میں شامل لوگوں کو ان سیاسی رہنماؤں کے ساتھ وابستہ ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان مذہبی افراد کی نہ تو کوئی خاص تعلیمی قابلیت ہوتی ہے اور نہ ہی شریعت کا کچھ علم رکھتے ہیں۔ یہ مذہبی عناصر خصوصاً ولایت ومعرفت کے لبادے میں چھپے ہوئے یہ مصنوعی گدی نشین اپنے مریدوں کو انتخابات میں اپنے من پسند سیاستدانوں کی حمایت کا حکم دیتے ہیں۔ یہ اپنے سرداروں کی عنایات کا بدلہ

مریدوں/عقیدت مندوں کے ووٹ سے دیتے ہیں۔ یہ طبقہ اپنی مذہبی طاقت، مفادات کے عوض سیاستدانوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں ایسے سماج دشمن مذہبی عناصر کی بہتات ہے، یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو ہمارا مرید صادق ہے اسے چاہیے کہ وہ ہمارے حمایت یافتہ سیاستدانوں کو ووٹ دے ورنہ اس کا ہمارے آستانے سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ انوار احمد نے اپنے افسانہ ''ناقابل اشاعت'' میں بدعنوان سیاستدانوں اور نام نہاد گدی نشینوں کے نجس گٹھ جوڑ کا پردہ چاک کرتے ہوئے ایک حضرت صاحب کا واقعہ رقم کیا ہے جو عالم جوانی سے بدکرداری، بدعملی کا مجسمہ تھے۔ سیاستدانوں کی آشیر باد سے سماج میں پہنچی ہوئی ہستی کے طور پر مشہور تھے۔ حضرت صاحب کی وفات کے بعد جب ان کی ذات پر تحقیقات کی جاتی ہیں تو ان کی ساری بے حیائی کی زندگی کا راز کھل جاتا ہے، مگر اس کو شائع نہیں کیا جاتا کیونکہ اس سے حضرت صاحب اور سیاستدانوں کے سارے کرتوت طشت از بام ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ہر بات کو صیغہ راز میں رکھنے پر اتفاق کر لیا جاتا ہے۔

> ''آزادی کے بعد صاجزادہ مرحوم ہر حکومت کے خیر خواہ رہے اور عملی تعاون کرتے رہتے اور ہر حکومت نے ان کے اس تعاون کا بھرپور جواب بھی دیا---ان حقائق کی روشنی میں خاکسار والا تبار سے دست بستہ التماس کرتا ہے کہ صاجزادہ مرحوم کی سوانح عمری لکھنے کا منصوبہ ترک کر دیا جائے۔ تاہم ان حقائق کو منظر عام پر نہ لایا جائے۔ تاکہ ایک طرف تو یادگار کمیٹی کی کاوشوں کو دھچکا نہ لگے اور دوسری طرف قومی نصاب کمیٹی کو ایک ہی برس کے اندر دوسرا نصاب مرتب نہ کرنا پڑے۔''(۲۲)

جنوبی پنجاب پر ہمیشہ چند طبقات نے راج کیا۔ ان میں سیاستدان، جاگیردار، پیر صاحبان اور بیوروکریسی شامل ہے۔ تینوں کا مقصد خطے کی ترقی یا عوام کی بھلائی ہرگز نہیں تھا بلکہ ہوس اقتدار اور وسائل پر قابض ہو کر ریاستی دولت پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔ اگر یہ طبقے عوام کے خیر خواہ ہوئے تو یہ خطہ ارتقا کی بلندیوں کو چھو رہا ہوتا، سیاسی، سماجی اور معاشی کمزوریاں نہ ہوتیں۔ سیاسی حکمران ہوں یا پیر صاحبان سب نے وسائل کو مال غنیمت سمجھ کر لوٹا۔ ترقی و خوشحالی لانے کی بجائے پورے خطے کو دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیا۔ عوام اور فلاحی منصوبوں کے لیے ملنے والے فنڈز لوٹ کر بڑے شہروں مثلاً لاہور، اسلام آباد وغیرہ جا کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، صرف انتخابات کے وقت نظر آتے ہیں۔ سادہ، مجبور عوام ان کے کھوکھلے نعروں کے پیچھے لگ کر اپنے آپ کو بلکہ پورے سماج کو تباہ کر دیا۔ بیوروکریسی نے اس معاشرے کے مقدس وجود میں اپنے دندان آز گاڑے رکھے لیکن اس کے محافظ اس کے باسی اس کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ چور لٹیرے اس خطے کو لوٹ کر فرار ہو جاتے، چور کون ہے اس کی خبر معلوم نہ ہوتی۔ ان لوٹنے والے تینوں طبقات کا مقصد حیات مشترک ہے کہ لوٹ کر اس خطے اور عوام کے وجود کچھ خطرات لاحق کرنا ہیں

۔ سماج تباہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے مگر ان کی تجوریاں مال و دولت سے بھری رہیں۔ جنوب پنجاب کے منفرد اسلوب کے افسانہ نگار علی تنہا اپنے افسانہ ''واردات'' میں خطے کے وجود کو چمٹے ہوئے تینوں لٹیروں کو علامتی انداز میں بے نقاب کرتے ہیں کہ گھر یعنی خطہ جنوب میں تین چور یعنی سیاستدان، نام نہاد پیر اور بیوروکریسی گھستے ہیں مگر پکڑے نہیں جاتے۔

بوڑھے کا کردار اس گھر یا سماج کے کمزور عوام ہیں جو اپنے سماج کو لٹتا تو دیکھتے ہیں مگر اس کو محفوظ کرنے یا چوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس اتنی طاقت نہیں حتیٰ کہ چور لٹیرے فرار ہو جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ تمام معاملات وقت کی گرد میں دب جاتے ہیں لیکن لوٹنے والے کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''یہ عجیب گھر ہے جس نے بھی اسے لوٹا وہ پکڑا آج تک نہیں گیا۔ کوئی بد دعا ہے اس گھر کو۔ یہ بوڑھا تو کوئی۔۔۔ اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ دو چار قدم اٹھا کر اس نے بہتیرا انہیں صحن میں ڈھونڈا۔ سچ مچ بوڑھے کے ساتھ دفان ہو گئے۔ یہ بوڑھا کون ہے۔" معا "اسے دھیان پڑا دیر تک اسے لگا کوئی دم کر کے چھوڑ گیا ہے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ وہ پھڑک کر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ ایک نظر اس بدنصیب گھر کو دیکھا۔ مگر اس کے اندر شک نے سر پھر آن اٹھایا۔''(۲۳)

علی تنہا کی سیاسی و سماجی عناصر پر گہری نظر کے حوالے سے ڈاکٹر محمد امین رقمطراز ہیں:

> ''علی تنہا صرف کہانی کار ہی نہیں بلکہ عالمی فکشن کا گہرا مطالعہ بھی رکھتا ہے افسانے کے بارے میں اس کا اپنا انداز نظر ہے۔۔۔ علی تنہا کہانی کو واقعات اور معروف زمانی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا قائل نہیں۔ وہ علامت کو اجتماعی حافظے کی بازیافت سمجھتا ہے اور تجربے کی جرأت رکھتا ہے۔ تجربے کے بغیر تخلیق کار جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔''(۲۴)

مہذب اور ترقی یافتہ معاشرہ اپنے عوام کیلئے بنیادی ضرورتوں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ صحت عامہ کی سہولتیں ہر کس و ناکس کیلئے مہیا کی جاتی ہیں۔ حکمرانوں کا دوسرے فریضوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی اہم ہوتا ہے کہ صحت و تندرستی کی بہترین سہولتیں مہیا کریں۔ جنوبی پنجاب میں طبقاتی اور مالی لحاظ سے افراد میں بہت امتیاز ہے۔ دولت مند، سردار و جاگیردار طبقہ دولت کے بل پر ہمہ قسمی طبّی سہولیات سے مستفید ہوتا ہے۔ جبکہ غریب جان لیوا امراض میں مبتلا ہو کر دوا علاج کے لیے سسکتے ایڑیاں رگڑتے بے بسی کے ساتھ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ پورے خطے میں طب کی سہولیات عنقا ہیں، اگر کہیں موجود بھی ہیں تو حالت انتہائی مخدوش ہے۔ سرکاری

ہسپتالوں میں اکثر ڈاکٹر اور دیگر عملہ مریضوں کے ساتھ انتہائی بے ہودہ اور نا قابل بیان طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ سرکاری ڈاکٹرز ایک تو تعداد میں کم ہیں دوسرا پھر مریضوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ ڈاکٹرز پوری توجہ کے ساتھ مریضوں کا معائنہ نہیں کرتے۔ ایمرجنسی کی صورت میں اس علاقے کے باسیوں کو اپنی مدد آپ کے تحت عوامی سواری یا گدھا گاڑیوں پر ہسپتالوں میں جانا پڑتا ہے۔ عطائی/ جعلی ڈاکٹرز طبی سہولیات کی بجائے موت کے مرکز کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی ناکافی طبی تعلیم اور نااہلی کے باعث الٹا سیدھا علاج کر کے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیتے ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں کے ڈاکٹر مریضوں کو پرائیویٹ کلینک، ہسپتالوں کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مریض ان ڈاکٹرز کی بات پر عمل نہ کرے اور سرکاری ہسپتال آجائے تو اس سے حقارت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ سرکاری ہسپتالوں کو مہیا ہونے والی ادویات افسران اور دواساز کمپنیوں کی ملی بھگت سے غیر معیاری بنائی جاتی ہے یا یہ کمپنیاں بظاہر تو دوائیں بھیج دیتی ہیں لیکن ہسپتال کا عملہ، سرکاری ہسپتال کا لیبل اتار کر نجی میڈیکل سٹوروں، ہسپتالوں میں بیچ کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ دردانہ نوشین خان حکمرانوں کی بے حسی اور جنوبی پنجاب کی عوام کے دکھ درد کا نوحہ اپنے افسانہ ''آشفتہ سری'' میں انتہائی اندوہ ناک انداز میں بیان کیا ہے۔ اس افسانہ میں ایک غریب لاچار لڑکی کے دکھوں کا ذکر ہے جس کے بھائی اپنی غربت کی وجہ سے اس کا علاج نہ کرا سکتے تھے۔ ایک دن اس غریب لاچار لڑکی کی سہیلی اس کو جیسے تیسے کر کے سرکاری ہسپتال لے جاتی ہے۔ ڈاکٹرز اس غریب مریضہ کا علاج کرنے میں عدم توجہی کرتے ہیں اور اسے ہسپتال سے بھگانے کے لیے باہر کی لیبارٹری سے ٹیسٹ کرانے کی ایک لمبی فہرست تھما دیتے ہیں۔ جن ٹیسٹوں کے کرانے کی اس کی مالی استعداد نہیں ہوتی، وہ ٹھوکریں کھا کر واپس موت کا انتظار کرنے کے لیے گھر آجاتی ہے۔ اس افسانے میں دردانہ نوشین خان نے پورے سماج میں صحت کے نظام اور ڈاکٹروں کے ظالمانہ رویوں کو موضوع بنا کر جنوبی پنجاب کے حالات کی حقیقی عکاسی کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''قدم قدم پر سانس کی جنگ لڑ رہی تھی۔ گلیوں سے نکل کر وہ کسی اوپن ڈالہ میں بیٹھیں۔ سول ہسپتال آیا تو پکڑ دھکڑ کر بہ دقت تمام فرحت کو اتارا گیا۔۔۔ پرچی پر دھکم پیل، ڈاکٹر کے کمرے کے باہر لمبی لائن، ڈاکٹر کا رسمی چیک اپ کے بعد ٹیسٹوں کی فہرست تھما دینا۔۔۔ لگتا تھا کسی اجنبی سیارے میں آگئی ہے جسم پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ جی الٹ رہا تھا۔ حال سے بے حال تھی۔''(۲۵)

اس خطے کو جان بوجھ کر ملک کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ پسماندہ رکھا گیا ہے۔ سیاستدان، جاگیردار، حکمران تو اپنا علاج باہر کے اچھے ہسپتالوں سے کراتے ہیں۔ اس لیے وہ عوام کی بھلائی یا سہولیات کے بارے نہیں

سوچتے۔ غریب عوام مختلف امراض میں مبتلا ہو کر مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کے جان دے دیتی ہے مگر بے حس حکمرانوں کو اس علاقے کے عوام کا ذرا بھی احساس نہیں۔

ب: معاشی مزاحمتی عناصر: منتخب افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

معیشت کسی بھی معاشرے کے قیام و دوام میں ریڑھ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو معاشرہ معاشی اعتبار سے مضبوط ہوتا ہے اس کے افراد خوشحال اور پر سکون زندگی گزارتے ہیں۔

"معاش کا تعلق روزی، خوراک، زمین جاگیر اور ہر اس شئے سے ہے جس سے بسر اوقات کی جائے۔"(۲۶)

ابن خلدون کے نزدیک:

"ان المعاش ھو عبارۃ عن ابتغا الزاق والتعائش فی تحصیلہ"۔(۲۷)

ترجمہ: معاش رزق ڈھونڈنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا نام ہے۔

جنوبی پنجاب میں دولت مند طبقے کو معاشی لحاظ سے کوئی فکر نہیں لیکن متوسط اور غریب طبقہ حالات کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ حکومتی سطح پر غربا اور سفید پوش طبقے کے لیے کوئی خاص مراعات یا معاشی صورت حال کی سہولیات نہیں ہیں۔ سیاستدان، جاگیر طبقہ نے ہمیشہ یہی نعرہ لگایا کہ وہ غریبوں کا ہمدرد ہے وہ غربت کو ختم اور معیشت کو بہتر کرے گا۔ دکانداروں پر مختلف قسم ٹیکس ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ مہنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ غریب اور سفید پوش طبقہ اس مہنگائی سے ٹوٹ کے رہ گیا۔ حکمرانوں کی عجیب و غریب معاشی پالیسوں نے غریب، نادار طبقے کو متاثر کیا۔ حکمرانوں کی ناقص معاشی پالیسوں اور عوام کی مجبوریوں کی عکاسی ڈاکٹر لیاقت علی نے اپنے افسانہ "پلیٹ فارم" میں بہترین انداز میں کی ہے جس میں وہ ایک باوضع اور سفید پوش بزرگ نیازی صاحب کا احوال بیان کرتے ہیں۔ کہ نیازی صاحب ریلوے اسٹیشن پر کتابوں کا اسٹال لگاتے ہیں جو ان کی معاشی ضروریات پوری کرتا ہے، حکمرانوں کی عجیب و غریب پالیسوں کی وجہ سے اس کا سارا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے۔ خریدار، منافع کم اور ٹھیکہ کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نیازی صاحب کو اپنا کاروبار جاری رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا ساز و سامان بیچ کر مختلف طریقوں سے اپنے معاشی حالات کو بہتر کرنے کی جدوجہد کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ یہ علامتی افسانہ ہے اس میں جنوبی پنجاب کو پلیٹ فارم اور عوام کو نیازی صاحب کی علامت میں پیش کیا۔ یعنی اس خطے میں عوام معاشی حوالے سے ذہنی دباؤ میں مبتلا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''حکومت نے غیر متعلقہ افراد کے اسٹیشن میں داخلے کو کم کرنے کے لئے پانچ روپے کے ٹکٹ فارم ٹکٹ کا اجراء کیا تو اسٹیشن سے ملحقہ آبادی کی وہ ساری خواتین جو نیازی صاحب سے رسائل، اخبارات اور ضرورت کی دیگر اشیاء منگوایا کرتی تھیں اب شہر ہی سے خریداری کرنے لگیں۔ مزید یہ ہوا کہ اسٹیشن کا علاقہ اب کینٹ میں شامل ہوا تو آرمی انسپکشن ٹیم کو لگا ایک سٹال کا چالیس ہزار سالانہ ٹھیکہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ یوں کھلی بولی ہوئی اور یہ ٹھیکہ ایک لاکھ فی سٹال تک جا پہنچا۔ چاروناچار نیازی صاحب نے ٹھیکہ لے تو لیا مگر ایک طرح کم ہوتی آمدنی اور دوسری جانب اخراجات میں اضافے نے انہیں قرض کے بوجھ تلے لا بٹھایا۔ دو تین برس کی بے سود کوشش کے بعد آخرکار وہ سٹال فروخت کرتے گھر جا بیٹھے۔''(۲۸)

افرادی قوت مضبوط معاشی پالیسی کی بنیاد ہوتی ہے۔ جس معاشرے کے پاس کارآمد اور محنتی کارکن ہوتے ہیں وہ اپنی معیشت کو بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ پیشہ ور ہنر مند افراد اپنی محنت و صلاحیت سے ریاستی انڈسٹری کو بام عروج تک لے جاتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں حکمرانوں، جاگیرداروں کی بدعنوانیوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے معیشت کو ناقابل تلافی ضرر پہنچا ہے۔ بے روزگاری، غربت کا خوفناک آسیب عوام کو گھیرے ہوئے ہے۔ خطے کے باصلاحیت نوجوان روزگار کی تلاش میں دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور ہیں۔ صنعتی ادارے بند، اگر کچھ ادارے کام کر رہے ہیں تو وہاں نوکری کا حصول کار دشوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے اردو افسانوی ادب میں مزاحمت کی ایک مضبوط سدادردانہ نوشین خان نے اپنے افسانہ ''دائرے سے باہر'' حکمرانوں کی ناقص معاشی پالیسیاں اور ہنر مند نوجوانوں کے بارے تصویر کاری کی ہے۔ ایک بیوہ، سکول ٹیچر جو اپنے بیٹے اور بیٹی کو بے کسی کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ جب بیٹا انجینئر بن جاتا ہے تو روزگار کے لیے بیرون ملک جانے کی تیاری کرتا ہے۔ ماں کا واحد سہارا یہی کہتا ہے کہ اس خطے میں روزگار نہیں، تنگ دستی اور غربت دیکھ کر بہت پریشان ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے مجبوراً اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ کر بیرون ملک جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔

''تبریز نے اپنی مرضی سے جدہ کی ملٹی نیشنل کمپنی میں پرکشش عہدہ کے لئے اپلائی کر دیا اور اپنے دوست کے سسر کی بدولت بہت پر امید تھا جو اس کمپنی میں اعلیٰ افسر تھے۔ 'تم مجھ سے اتنی دور چلے جاؤ گے۔۔۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا'' عابدہ سر تھام کر رہ گئی ''امی؟ مجھے ایسا مقام پاکستان میں برسوں نہیں مل سکتا، یہاں میں جانے کب تک سی وی جمع کراتا اور جوتیاں چٹخاتا رہوں۔۔۔ مگر ایک لیڈی ٹیچر کی یتیم بیٹی کے لیے اچھا ترس تو مل

سکتا ہے اچھا رشتہ نہیں آتا۔ میری اعلیٰ پوسٹ اُسے بہتر مستقبل دے گی۔۔۔ میں یہ پیسہ
کس کی خاطر کماؤں گا اپنی ماں اور بہن کی خاطر "(۲۹)

معاشی ذمہ داری جب عورت کے ناتواں وجود پر ہو تو یہ معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ عورت کو سماج میں بہت سے بھیانک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کے گھریلو، سماجی و معاشی حقوق کا خطرناک حد تک استحصال کیا جاتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں سماجی رویوں کے حوالے سے عورت کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے، خصوصاً دیہاتی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ لڑکی ذات کو پڑھا کر کیا کریں گے۔ یہ تو پرایا دھن ہے، جب کرنی ہی ہانڈی روٹی ہے تو تعلیم کا کیا فائدہ۔ اگر کوئی لڑکی تعلیم حاصل کر لے تو اس شرط پہ کہ شادی کے بعد نوکری نہیں کرے گی۔ حالانکہ پڑھی لکھی خاتون زندگی کے کسی دشوار مرحلے پر دوسروں کے دست نگر نہیں ہو گی بلکہ اپنی تعلیم کے ذریعے خودداری اور عزت نفس کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکے گی۔ جنوبی پنجاب کے سماجی نظریات عورت کو محض اپنے اختیار میں محبوس اور قفس میں قید پرندے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ عورت کی تعلیم اور ملازمت کرنے کو اپنی غیرت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ عورت کو اگر کہیں ملازمت ملی بھی تو متعلقہ محکموں، دفاتر میں ان خواتین کو نامناسب اور تکلیف دہ رویوں، حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ظلم تو یہ ہے کہ اکثر خواتین کو اپنے گھر والوں کی جانب سے انتہائی طنز و ملامت کا نشانہ بنایا گیا۔ جنوبی پنجاب کے انتہائی پسماندہ علاقے کی اعلیٰ شعور افسانہ نگار راشدہ قاضی اپنے افسانہ "چھوٹی سی غلط فہمی" میں ناگفتہ بہہ مسائل کا سامنا کرنے والی خاتون رخشندہ بیگم کی کہانی بیان کی جس میں اس کا خاوند نکھٹو، زبان دراز ہوتا ہے جو گھر کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود تو کچھ نہیں کرتا مگر اپنی بیوی کو تیز دھار جملوں سے ضرور زخمی کرتا ہے۔ گھر کی معاشی ضرورتوں کو رزق حلال سے پورا کرنے والی بیوی کو گھائل کرتا رہتا ہے۔ انہی اندوہ ناک رویوں کا سامنا کرتے کرتے آخر کار رخشندہ بیگم جان کی بازی تک ہار جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"یار! یہ بندہ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ اب کیا فرماتا ہے؟ بہت گھٹیا زبان استعمال کرتا ہے۔ ارے تم تو زرد ہوتی جا رہی ہو۔ شاید تمہارا بلڈ پریشر Low ہو رہا ہے ٹھہرو میں لیمو پانی پلاتی ہوں۔ ارے یہ تو بے ہوش ہو گئی۔۔۔ وہ ہم سب کی آئیڈیل تھیں۔ بہت اچھی ورکر، کمال کی ایڈمنسٹریڑ شاندار شخصت۔ تمام برانچز کا ریکارڈ مینٹین کرنا، تمام مینجرز سے ڈیل کرنا، یہ سب ہنر انہی پہ ختم تھے۔"(۳۰)

معاشی خوشحالی اور دولت کمانا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت حاصل کرنے لئے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں غربت اور معاشی بدحالی میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عوام کا خیال ہے کہیں نہ کہیں یا کسی بھی ذریعے سے وہ اچانک مالدار بن جائیں۔ سادہ لوح عوام لوگ مختلف قسم کے جعلی عاملین کے ہتھے

چڑھ جاتے ہیں جو انہیں سونے کی دیگ یا مدفون خزانے کا لالچ دے کر نذرانے کے نام پر بھاری رقوم اینٹھ لیتے ہیں۔ ''سونے کی دیگ'' جاوید اختر بھٹی کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں معاشی خوشحالی مال و دولت جمع کرنے والے ایک شخص بابو سلام کا واقعہ ہے۔ بابو سلام سونے کی دیگ کے حصول کے لیے اپنے گھر کو کھود ڈالتا ہے لیکن کچھ نہیں ملتا۔ آخر کار اپنا گھر بیچ ڈالتا ہے۔ خریدنے والے نے اس گھر کو سجایا سنوارا خوش حال زندگی بسر کرنے لگا۔ بابو سلام سمجھا کہ اسے سونے کی دیگ مل گئی ہے۔ وہ نئے مالک مکان کے پاس آتا ہے اور سونے کی دیگ سے اپنا حصہ طلب کرتا ہے۔ مالک مکان کے انکار پر بابو سلام شور شرابا کرنے لگا اور نئے مالک مکان پر الزامات لگا دیئے بابو سلام نے اپنا گھر بیچ کر پھر بغیر محنت کے دولت کمانا کے چکر میں الزامات پر اتر آیا۔ گلی محلے میں گزرتے ہوئے لوگ اسے سونے کی دیگ کہہ کر پکارتے ہیں تو چونک جاتا ہے کہ کہاں ہے؟ اب بابو سلام بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ دراصل بابو سلام کو جنوبی پنجاب کے حکمران/سیاستدان طبقہ کی علامت بنا کر پیش کیا گیا۔ اس حکمران طبقہ نے پورے خطے کے وسائل کو بیچ کر حلقے کی عوام کو بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ خطے میں سماجی و فلاحی کاموں کے لیے اب یہ سیاستدان وفاقی اور عالمی اداروں سے چیئریٹی یا امداد کے نام پر بھیک مانگتے ہیں۔ انتخابات کے وقت کہتے ہیں ہمارے پاس تو وسائل اور فنڈز نہیں ہیں ہم مجبور ہیں درحقیقت خطے کے وسائل اور فیکٹریوں میں موجود ہنر مند افراد کی آسامیاں یہ باہر کے علاقوں کے لوگوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ اپنے خطے کی عوام بھوک، غربت سے مر رہی ہے یا بھیک مانگنے پر مجبور ہے لیکن ان کو پرواہ نہیں دوسری سیاسی جماعتوں یا ان کے سربراہان پے الزام لگاتے ہیں۔

> ''آپ بے شک رجسٹری دیکھ لیں۔ میں نے آپ کو مکان فروخت کیا تھا۔ سونے کی دیگ فروخت نہیں کی تھی۔ یہ میری امانت آپ کے پاس تھی۔ آپ کی خاطر میں یہ کر سکتا ہوں کہ اس میں سے آدھی دیگ آپ رکھ لیں اور آدھی مجھے دے دیں۔۔۔ جب وہ بازار سے گزرتا تو کوئی شرارتی لڑکا آواز کستا۔ ''سونے کی دیگ'' بابو سلام رک جاتا کہاں ہے سونے کی دیگ؟ کہاں ہے؟ وہ تو ملک لال کھا گیا اور پھر وہ ملک لال کو برا بھلا کہتا۔ بددعا دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔''(۳۱)

غربت انسان کو مایوسی کی طرف دھکیلتی ہے اور مایوسی حدِ کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ غربت و افلاس ایک ایسی ہزار بلا ہے جو جسے بھی اپنے شکنجے میں لیتی ہے اس کو لبِ دم کر دیتی ہے یا جان لے لیتی ہے۔ جنوبی پنجاب میں غربت اس قدر ہے کہ غریب عوام پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے روٹی کے دو نوالوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ سیاستدان، جاگیر دار طبقہ اپنے مفادات اور اقتدار کے حصول کے لیے پارٹیاں بدل رہے ہیں۔ ایم پی اے، ایم این اے کی کروڑوں، اربوں میں بولیاں لگ رہی ہیں۔ بڑی بڑی مراعات دی جا رہی ہیں مگر حکمران طبقہ غریب عوام کے لیے کچھ بہتر کرنے سے محروم

ہے۔ غریب آدمی بھوک سے بے بس ہو کر اگر روٹی چراتا ہے تو اس کو سخت سے سخت سزا ملتی ہے جبکہ صاحب اقتدار طبقہ ریاست، ملک کو لوٹ کر کھا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ جنوبی پنجاب کو حکمرانوں کی طرف سے استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔

معروف افسانہ نگار جاوید اختر بھٹی حکمرانوں کے رویے اور غریبوں کی بے بسی کا ہولناک منظر نامہ اپنے افسانہ ''شہ رگ'' میں ایک بچے کا اپنے باپ سے مکالمہ پیش کرتے ہیں کہ ایک بچہ جو بھوک کے درد میں مبتلا ہے۔ امید اور کرب کی ملی جلی کیفیت میں اپنے باپ سے سوال کرتا ہے کہ اللہ ہمیں روٹی دے گا؟ وہ ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، کیا وہ ہماری سنتا ہے؟ یہ چاند جو اتنا بڑا ہے، روٹی کی طرح دکھائی دیتا ہے کیا سچ میں روٹی بن کر ہمیں مل سکتا ہے؟ اس افسانے میں انسانی ضمیر کو جھنجوڑا گیا۔ جن کی ساری حیاتی بھوک وافلاس کے بوجھ تلے ایڑیاں رگڑتے گزری۔ اس خطے کی غریب عوام کی کیا زندگی جن کو زندگی نے درد والم کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جن کی زندگی حسرت ویاس کی مجسم تصویر بنی رہی۔ اقتباس دیکھیں:

> ''یہ بچہ ان بچوں میں سے ایک ہے جو بچے ہوتے ہیں یا بوڑھے ہوتے ہین نکھرے نکھرے گھبر و کبھی نہیں ہوتے۔ بچے کا باپ یوں تو اڈھیر عمر ہے، مگر بھوک نے سو سال کا اپاہج بوڑھا بنا دیا ہے۔ اس کی کمر میں خم پڑ گیا ہے۔۔۔ باپ نے بیٹے کی گردن پہ ہاتھ رکھ کر کہا 'یہاں ہوتی ہے شہ رگ'، 'ابا پھر تو خدا میرے پاس ہی رہتا ہے' 'ہاں پاس ہی رہتا ہے' 'ابا' 'ہاں' خدا سے ایک روٹی مانگوں؟'' (۳۲)

عرش صدیقی جاوید اختر بھٹی کے بارے کہتے ہیں:

> ''جاوید اختر بھٹی کے افسانے متمدن معاشرے میں انسان کے اخلاقی زوال اور حق و صداقت کی حرمت کی موت پر لکھے دل گداز اور لرزہ خیز نوحے ہیں۔ یہ اشارہ اس کی شخصیت اور فن کی تفہیم کیلئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔ اقدار کی شکست وریخت اور قول و فعل کا تضاد مسلسل جاری ہے۔ جاوید اختر بھٹی اس صورت حال کو بدلنے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ خود غرض جذبوں اور جبلتوں میں اسیر اانسان نما حیوانوں کو شعور کی روشنی دکھانا چاہتا ہے۔'' (۳۳)

حکمران نت نئے ٹیکس لگا کر عوام کا استیصال کرتے ہیں اور غنڈہ عناصر عوام میں کھلے عام لوٹ مار کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ہدف تاجر اور صنعت کار ہوتے ہیں۔ غریب دکاندار، چھوٹے چھوٹے کاروبار کے مالک، ریڑھی

بان، چھابڑی فروش اور دیگر اس نوعیت کے لوگ جو فقط جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اس سماج دشمن عناصر کی جانب سے آئے روز مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ بھتہ خور طاقت ور اور باقاعدہ غنڈہ گردی کے ماہر ہوتے ہیں، اپنی مرضی سے غریبوں کی کمائی چھین لینا ان کا معمول ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوکاندار اعتراض یا مزاحمت کرے تو اسے تشدد کر کے ادھ موا کر ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں نے ہر سمت خوف و دہشت کی فضا پیدا کر رکھی ہوتی ہے۔ جنوبی پنجاب میں کارخانے، فیکٹریاں، وڈیروں، سیاستدانوں کی بلیک میلنگ اور بدمعاشی کی وجہ سے بھتہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں اگر بھتہ نہ دیں تو ان کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیے جاتے ہیں۔ علی تنہا نے اپنے افسانہ ''اپنا اپنا راستہ'' میں بیان کرتے ہیں کہ چوہدری دستگیر اپنی دھاک بٹھانے کیلئے طوطا فصلی نامی اونچے لمبے قد کاٹھ کے غنڈے کو لے آتا ہے جو نہ صرف چوہدری دستگیر کو تحفظ فراہم کرتا ہے بلکہ پوری منڈی میں دہشت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ بھتہ خوری کا کام بھی سرانجام دیتا ہے غریب دکاندار چپ کر کے رقم بطور بھتہ دیتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے کاروبار اور عزت کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی عزیز ہوتی ہے۔

> ''چھم چھم بے چارے کو صبح سویرے تایا ہوٹل والا چائے دے کر جب بھی توتے کے ہاں بھیجتا ہے۔ اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ کیا معلوم کس وقت بے نصیب کی ماں بہن ایک کر دے۔۔۔ توتا جب بھی آتا ہے۔ تایا کی پشتوں کو دھنک کے رکھ دیتا ہے۔ پاؤ ڈیڑھ پاؤ برفی ہڑپ نہ کر لے تو اسے توتا مصلی کون کہے۔ دل میں آئے تو بیس تیس روپے دے دے۔ دل کرے تو یہ جا وہ جا۔ بے چارہ تایا دانت نکوستارہ جاتا ہے۔ ورنہ تایا اور پیسے چھوڑے؟'' (۳۴)

سماج یا خطے کی قدر و منزلت اور استحکام اس کی مضبوط معیشت سے جڑا ہوتا ہے۔ معاشی اعتبار سے مستحکم سماج اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں آزادانہ فیصلے کرتے ہیں کیونکہ وہ کسی کے دستنگر نہیں ہوتے۔ کمزور معیشت والی ریاستیں ہمیشہ حقارت و ذلت کے ساتھ جیتی ہیں۔ ایسی ریاستوں اپنے معاملات رواں دواں رکھنے کیلئے بھاری رقوم کی ضرورت ہوتی ہے جو خود تو پورا نہیں کر سکتیں اس لیے عالمی سطح پر مضبوط معیشت رکھنے والے ممالک کی طرف سے قرضہ اور کبھی امداد کے نام پر جھولی پھیلائے بھیک مانگنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس خطے کے حکمرانوں نے ریاستی اساسوں کو دشمن کی گود میں ڈال کر پوری قوم کی عزت و توقیر کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

اس خطے کے حکمرانوں کی معیشت و ترقی کیلئے کوئی واضح سوچ نہ ہونے اور عوام کو قرضوں کی دلدل میں دھکیلنے کے ساتھ ساتھ ان کے وقار کو دشمن کی آغوش میں ڈالنے کے حوالے سے انوار احمد اپنے افسانہ "چرم ہائے

قربانی''میں علامتی انداز میں اظہار کیا۔ دو بھائی سزاوار خان اور ناسزاوار خان جو اپنے دشمن سے بدلہ لینے کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ لیکن بدلہ لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ بڑا بھائی دشمن سے بدلہ لینے کیلئے چھوٹے بھائی کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں تاجر کے پاس جاؤ اور ہتھیار لے آؤ تاکہ ہم دشمن کے مدمقابل نہتے نہ ہوں، اپنی عزت دشمن کے ہاتھ گنوا نہ بیٹھیں۔ ادھر وہ تاجر بھی اسی تاک میں ہوتا ہے کہ جو ہتھیار سزاوار خان اور ناسزاوار خان کو فراہم کرنا چاہتا ہے وہ ان کے دشمن کو دے چکا ہوتا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے اس کے پاس باقی ماندہ ہتھیاروں کا کوئی خریدار ہو۔ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے دونوں بھائیوں کو ہتھیار فراہم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن کو اس تاجر کے پاس گروی رکھیں گے۔ دونوں بھائی مشورہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دشمن سے عزت گنوانے کی بجائے دوست کے پاس عزت گروی رکھنا مناسب ہے۔ وہ اپنی بہن کو تاجر کے پاس بھیج دیتے ہیں اور اپنے تحفظ کے لیے بندوق حاصل لیتے ہیں۔ اب ان کے پاس ہتھیار تو موجود ہے جس سے دشمن کا مقابلہ کر سکیں تاجر کے پاس اپنی عزت گروی رکھ کر خود بخود ذلت و پستی میں گر چکے ہوتے ہیں۔ اس خطے کے حکمران دشمن سے بدلہ لینے کیلئے ہتھیار خریدتے ہیں یا پھر عیش و عشرت کے لیے رقوم عالمی مالیاتی اداروں سے بطور قرض لے کر ریاستی، قومی عزت و قار ان کے پاس گروی رکھ دیتے ہیں۔ قوم غربت وافلاس کے ساتھ ساتھ بے عزتی کے امیق تر گڑھے میں گِر رہے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سزاوار خان نے دہشت زدہ ہو کر کہا "ناسزا خاں، ہم دشمن سے اپنی بہن کی عزت بچانے کے لیے بھی تو لڑ رہے ہیں۔" ناسزا خان نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ "سزاوار خاں! عزت دشمن سے گنوانے کی بجائے دوست کے پاس گروی رکھنا بہتر ہے۔۔۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ ناسزا خاں نے آگے بڑھ کر پہلے عفت کو تھپکی دی پھر سزاوار خان کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھا اور پھر پہاڑ کی دوسری جانب باہیں پھیلائے وادی میں اتر گیا۔''(۳۵)

شوکت علی مغل انوار احمد کی تخلیقی اور فکری سوچ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غریبوں کا استحصال، معاشرتی ناانصافی، سماجی ناہمواری، دولت کی غلط تقسیم، رویوں میں عدم مطابقت جیسے کئی موضوعات کو وہ ایک ہی سطر میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ دلفریب انداز سے کڑوے سچ کو الفاظ کی چاشنی میں ڈبو کر تشبیہ اور استعارے کی سجاوٹ کے ساتھ ہمیں کھلا دیتے ہیں جو حلق سے اتر کر شکم میں ہلچل مچا دیتی ہے۔''(۳۶)

جب سے جنوبی پنجاب میں سیاست و جمہوریت کا چلن عام ہوا، مہنگائی، بے روزگاری اور غربت کی شرح میں مسلسل اضافہ ہوا۔ جمہوریت کا نعرہ روٹی، کپڑا اور مکان اپنی آواز کی گونج میں دب گیا۔ خطے میں معاشی تباہی کے چند اسباب ذیل میں ملاحظہ ہوں:

- ارکان پارلیمنٹ کی بھاری تنخواہیں، مراعات اور فلاحی منصوبوں کے نام پر فنڈز ہڑپ کرنا وغیرہ
- وزیروں مشیروں کی وسیع فوجیں اور ان کے پروٹوکول وغیرہ
- بیوروکریسی کی بھرمار، بڑی بڑی سہولتیں، رشوت و بدعنوانی کا چلن وغیرہ

ایک طرف حکمران، بیوروکریسی کلیدی عہدوں پر بیٹھے ہوئے مختلف حکومتی شعبوں کے افسران دولت کے انبار جمع کر رہے ہیں تو دوسری طرف عوام معاشی دباؤ کی وجہ سے خودکشیاں کر رہی ہے۔ ہر آنے والی نئی حکومت سابقہ حکومت پر الزامات عائد کرتی ہے کہ ریاست، خطے کو دیوالیہ کر ڈالا۔ لہٰذا معاشی تباہی کے ذمہ دار وہی حکمران ہیں۔ ہمیں کچھ وقت لگے گا اور ہم معاشی حالات بہتر ڈگر پر لے آئیں گے مگر افسوس کہ کئی کئی سال حکومت کرنے کے باوجود بہتری نہیں آئی۔ معیشت تیزی سے گر رہی ہے۔ علی تنہا نے حکمرانوں کی ان معاشی پالیسوں کو اپنے افسانہ ''جھولنے والا پُل'' کو علامتی طور پر ڈگمگاتی معیشت کے طور پر ظاہر کیا۔ معاشی کیفیت اس جھولتے، زنگ خوردہ پُل کی طرح ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے روبزوال ہے، مسلسل گرنے کے خطرے سے دوچار ہے کہ کسی وقت بھی یہ جھولتا پل دریا بوس ہو سکتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''جگہ جگہ سے اکھڑے پل سے لپٹی خلقت جھول رہی تھی، گویا جھولے میں پڑے پڑے ان کی عمریں گزر گئی ہیں۔ اب روشنی آنے پر اس نے غور سے لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب کے سب عمر کے ابتدائی حصے میں تھے اور جھولتے پل کے جھولے میں مزے سے پڑے غوں غاں کر رہے تھے۔'' (۳۷)

جب بھوک کی شدت سے پیٹ میں گرہیں پڑ رہی ہوں تو غریب شکم کی آگ سرد کرنے کے لیے کسی حد تک بھی گر جاتا ہے۔ بھوک کی وجہ سے کئی لوگوں نے اپنے بچے فروخت کر ڈالے یا اپنے بچوں کو اپنے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کئی دوشیزائیں اپنی عفت و پاکیزگی داؤ پر لگا کر گھر کے افراد کی بھوک مٹانے کے لیے، بھوکے درندوں کے سامنے خود کو پیش کر دیا۔ لوگ غربت و افلاس اور کثیر العیالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انتہائی مکروہ دھندوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے پیچھے معاشی مجبوریاں کارفرما ہوتی ہیں۔ جو ان غیر اخلاقی معاملات کا محرک بنتی ہیں۔

"قومی استحکام سے معاشی استحکام کا ربط کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ جرائم اور معاشرتی برائیوں کی غالب تعداد غربت کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے۔"(۳۸)

کوئی مثبت معاشی سوچ نہ ہونے کے باعث عوام زبوں حالی کا شکار ہے۔ عوام الناس کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ انہی معاشی مجبوریوں کی بناپر بعض لوگ انتہائی غیر اخلاقی معاملات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

انوار احمد نے اپنے افسانہ "نوجی" میں ایک غریب رکشہ ڈرائیور اور عورت کا واقعہ بیان کرتے ہیں جس میں وہ اپنی معاشی مجبوریوں کے تحت جسم فروشی پر اتر آتے ہیں۔ رکشہ ڈرائیور، عورت کو مطلوبہ مقام پر لے آتا ہے تو وہاں طلب کرنے والا موجود نہیں ہوتا اور رکشہ والا عورت سے اپنا کرایہ مانگتا ہے۔ وہ عورت بجائے کرایہ دینے کے برہنہ ہو کر اسے دعوت گناہ دیتی ہے کیونکہ اس کے پاس کرایہ دینے کے لیے رقم نہیں ہوتی وہ مجبوراً اپنے جسم سے کرایہ ادا کرتی ہے۔ مگر رکشہ ڈرائیور اس سے بھی زیادہ معاشی مجبوریوں کے حصار میں ہوتا ہے جو اس عورت کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھتا بلکہ اسے برہنہ چھوڑ کر اس کے کپڑے اٹھالیتا ہے جنہیں بیچ کر اپنا خسارہ، معاشی ضرورت پوری کرتا ہے۔ عورت معاشی بدحالی کی وجہ سے اپنا جسم تک فروخت کرنے پر اتر آتی ہے اور رکشہ ڈرائیور اپنے کرائے کے حصول کے لیے عورت کے کپڑے اٹھالیتا ہے اور اس کی بے لباسی کا خیال نہیں کرتا۔ اقتباس دیکھیئے:

"بس جی یہ سن کر اس نے مجھے اندر بلالیا اور کہنے لگی "میرے پاس پیسے بالکل نہیں مگر گھبراؤ نہیں میں پورا کرایہ ادا کروں گی۔ اس نے تو جی ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔۔۔ میں نے تو وہ کپڑے اٹھائے اور وہاں سے دوڑ لگائی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "لعنت ہو تم پر خدا کی، بلکہ پوری ملت اسلامیہ کی۔" وہ کہنے لگا" باؤ جی! میرے گھر کھان والے نوں جی ہیں۔"(۳۹)

انوار احمد ایک حساس اور درد مند دل رکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ جو اپنے خطے کی سماجی و معاشی مشکلات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جنوبی پنجاب کے افراد کی معاشی مشکلات کو ایک نباض کی طرح نہ صرف سمجھا ہے بلکہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے درپیش مسائل کو اجاگر کیا۔ درحقیقت وہ اپنے افسانوں کے ذریعے ارباب اختیار اور نام نہاد مہذب دنیا کا ضمیر جھنجوڑتے ہیں، حکمران ہوں یا امراء کسی کو بے بسی کی زندگی بسر کرنے والے غرباء و مساکین کی جانب جھانکنے تک کی توفیق نہیں کہ کون کس خستہ حالی اور غربت ولاچاری کی بناپر اخلاقی و تہذیبی حدود فقط روٹی کے حصول کے لیے توڑنے پر مجبور ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کرشن، گوپال۔سماج شاستر،آگرہ:ایس بی پی ڈی پبلشنگ،۲۰۰۹ء،ص۶۔

۲۔ غلام رسول۔اسلام کا عمرانی نظام،لاہور:علم عرفان پبلشرز،۲۰۰۴ء،ص۴۴۔

۳۔ کرشن، گوپال۔سماج شاستر،آگرہ:ایس بی پی ڈی پبلشنگ،۲۰۰۹ء،س۴۳۔

۴۔ خٹک، خوشحال۔معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ،اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۱۹۸۹ء،ص ۳۳۹۔

5. E.D. Domar, Economic Groth: An Economic approach, American Economic Review, Vol xvii, No. 2, May 1952, p 481

۶۔ فیروزالدین۔فیروزاللغات،س ن،ص ۱۱۳۱

7. V.A. Demant, Religion and Decline of capitalism NewYork, USA, 1952, p 147

۸۔ خان،حفیظ۔لاہورجان اور دوسری کہانیاں،لاہور:فائن گراف پرنٹرز،۲۰۲۰ء،ص۶۹۔

۹۔ ایضاًص۱۲۱۔

۱۰۔ ایضاًص۹۶۔

۱۱۔ یاد،منشا۔فلیپ،لاہورجان اور دوسری کہانیاں،لاہور:فائن گراف پرنٹرز،۲۰۲۰ء،ص۴۔

۱۲۔ اعجاز،احمد۔کہانی مجھے تلاش کرتی ہے،فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۱ء،ص۳۰۔

۱۳۔ ایضاًص۶۹۔

۱۴۔ علی،لیاقت۔جھوٹے آدمی کے اعترافات،ملتان:بیکن بکس،۲۰۱۸ء،ص۵۳۔

۱۵۔ ایضاًص۱۰۳۔

۱۶۔ قاضی،راشدہ۔پہلی سی محبت،فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۲ء،ص۲۰۳۔

۱۷۔ اوٹاوے،اے۔کے سی۔تعلیم،سماج اور کلچر۔مترجم انصاری،اختر۔لاہور:بک ہوم،۲۰۰۵ء،ص۱

۱۸۔ نوشین،وردانہ۔ریگ ماہی،لاہور:حاجی حنیف پرنٹرز،۲۰۱۵ء،ص۱۷۱۔

۱۹۔ قاضی، راشدہ۔ ۳۶ گھنٹوں میں سے ۱۵ منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۲۔

۲۰۔ علی، مبارک۔ تاریخ اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۵۔

۲۱۔ اختر، جاوید۔ چاند کے زخم، ملتان: پاکیزہ پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱ء، ص ۶۳۔

۲۲۔ احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵۔

۲۳۔ تنہا، علی۔ سورج کے سب لوگ، ملتان: پاک شہید پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۔

۲۴۔ امین، محمد۔ تنقیدی مطالعے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۵۶۷۔

۲۵۔ نوشین، وردانہ۔ ریت میں ناؤ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۔

۲۶۔ مہذب، مرزا۔ مہذب اللغات، لکھنؤ: انجمن محافظ اردو، ۱۹۵۵ء، ص ۳۲۸۔

۲۷۔ بن خلدون، عبدالرحمن۔ مقدمہ ابن خلدون، مکۃ المکرمہ: المکتبہ التجاریہ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۵۔

۲۸۔ علی، لیاقت۔ پلیٹ فارم، ملتان: صنوریز پرنٹرز، ۲۰۰۸ء، ص ۶۱۔

۲۹۔ نوشین، وردانہ۔ ریگ ماہی، لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۰۔

۳۰۔ قاضی، راشدہ۔ ۳۶ گھنٹوں میں سے ۱۵ منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶۔

۳۱۔ اختر، جاوید۔ سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن، ملتان: قندیل پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۲۹۔

۳۲۔ اختر، جاوید۔ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۔

۳۳۔ صدیقی، عرش۔ فلیپ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹۔

۳۴۔ تنہا، علی۔ الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء، ص ۴۲۔

۳۵۔ احمد، انوار۔ ایک ہی کہانی، لاہور: سنگ میل، پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۔

۳۶۔ علی، شوکت۔ "ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوی پارے"، روزنامہ نوائے وقت، ملتان: ۱۳ اپریل ۲۰۰۴ء۔

۳۷۔ تنہا، علی۔ بھول کی گھنٹیاں، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۶۴۔

۳۸۔ بدر، جہانگیر۔ جمہوریت کا ارتقاء، لاہور: اعزاز الدین ٹی۔ بی۔ ایم پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۴۔

۳۹۔ احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۔

باب چہارم

جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول اور جاگیرداری نظام کے خلاف مزاحمت

الف: جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول! منتخب افسانہ نگار کا تقابلی مطالعہ

ب: جنوبی پنجاب میں جاگیرداری نظام کے خلاف مزاحمت! منتخب افسانہ نگاروں کا تجزیاتی مطالعہ

جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول اور جاگیرداری نظام کے خلاف مزاحمت

جنوبی پنجاب ایک زرخیز خطہ ہے یہاں کی آبادی کا زیادہ تر حصہ زراعت سے وابستہ ہے۔ زمانہ قدیم سے یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کر کے اس کی اجرت اور آمدنی سے اپنی دیگر ضروریات زندگی پوری کرتے آئے۔ پورے خطے میں گندم، چاول، کپاس، آم، کھجور وغیرہ کے باغات کے اپنی مناسب اوسط اور مٹھاس سے ملک اور بیرون ملک اہمیت رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ فصلوں کی اوسط آمدنی میں کمی ہوتی گئی۔ یہاں کے کسانوں نے ان مسائل پر آواز بلند کی لیکن کوئی دادرسی نہیں ہوئی۔ ناقص پالیسیوں اور حکومت کی عدم توجہی سے مسائل حل ہونے کی بجائے مزید بڑھتے گئے۔

> " South Punjab is one of Pakistan's most fertile areas having extraordinary potential for agriculture and farming. Also, it is blessed with diligent... unfortunately, The region has failed to get the attention of the policy tmakers so for, which is hurting everyone's cause; most of all , the national cause." (1)

اس خطے میں زراعت اور کاشت کار دونوں زوال پزیر ہیں۔ زراعت سے وابستہ افراد مایوسی اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کسانوں کا اس قدر استحصال کیا جا رہا ہے کہ زراعت کا شعبہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ زراعت میں استعمال ہونے والی اشیاء مثلاً بجلی، پٹرولیم، اسپرے اور دیگر زرعی آلات کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہو چکا ہے۔ زرعی مصارف کے مقابلے میں فصلوں کی پیداوار روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، کبھی کھادوں کا بحران تو کبھی بروقت بیج مہیا نہیں ہوتے۔ کبھی نہری پانی میسر نہیں تو کبھی آپٹوپس پٹواری کسان کا دیوالیہ نکال دیتا ہے۔ جس بھی پارٹی کی حکومت آتی ہے وہ کسانوں کے مفادات کا استحصال کرتی ہے۔

عام کسانوں کو کوئی سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں۔ کسانوں کو بیج کھاد اور دیگر زرعی مصارف میں بھیانک حجم کے ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ منافع کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ چھوٹے کسان اپنی کھیتی باڑی کے اخراجات پورے نہیں کر پاتے تو قرض لے کر اپنی زمینوں پر فصلیں کاشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جب یہ فصلیں پک کر تیار ہو جاتی ہیں تو ان کا اکثر حصہ قرض کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ جس میں کھاد مافیا، سیڈ مافیا اور پٹوار مافیا وغیرہ شامل ہیں۔ چاروں طرف سے کسان استحصال کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جنوبی پنجاب کے شمال مغربی حصے میں پہاڑی سلسلہ ہونے کے باعث ہر سال فصلیں سیلاب کی زد میں آجاتی ہیں۔ جبکہ میدانی علاقے میں کہیں صحرا تو کہیں سیم تھور ہے۔ ان علاقوں میں فصلوں کی بہتری کے لیے کسی حکومت کی طرف سے کوئی خاص منصوبہ تشکیل نہیں دیا گیا کہ ان علاقوں کو قابل کاشت بنایا جائے۔ چھوٹے پیمانے پر کاشتکاری کرنے والا سب سے زیادہ زرعی استحصال کی زد میں ہے۔ حکمرانوں

نے کبھی عام زمیندار یا چھوٹے کاشتکار کی فلاح کے منصوبے تشکیل نہیں دیے۔ اگر کبھی زرعی منصوبے وجود میں آئے بھی ہیں تو ان کا براہ راست فائدہ جاگیرداروں کو ہوا ہے۔ کیوں کہ یہ بڑے کاشتکار یا جاگیردار اپنے مفادات کا تحفظ کرنے والے سیاستدانوں کو پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں، پھر ان کی طاقت سے اپنے مطلوبہ فوائد حاصل کرتے ہیں۔

> "اس جاگیردار جمہوریت میں جمہوری ادارے ان کے لیے موثر ہتھیار ہیں کہ جن کو وہ اپنی ذات کے لیے استعمال کرتے ہیں پارلیمنٹ میں ایسے قوانین پاس ہوتے ہیں کہ جو ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس لیے آج زرعی ٹیکس پاس نہیں ہو سکا۔ کیونکہ پارلیمنٹ میں ان کی اکثریت ہے جو اس بل کو پاس نہیں ہونے دیتی ہے۔"2

کہنے کو تو اس خطے میں جمہوری نظام حکومت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس خطے میں جمہوریت عوام کی نہیں بلکہ جاگیرداروں کی ہے۔ جاگیرداروں، سیاستدانوں اور بیوروکریسی نے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے متعدد بار یہاں کے جمہوری عمل کو ثبوتاژ کیا۔ اس جاگیردارانہ اور سیاسی منظر نامے میں بہت سے عناصر موجود رہے ہیں۔ جن میں جاگیردار مذہبی افراد اور ان کے مفادات کے لیے کام کرنے والے عام افراد، قانون نافذ کرنے والے اداروں میں کالی بھیڑیں، گاؤں گاؤں میں موجود چٹی دلال اور مختلف قسم کے افراد اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے خطے اور عوام پر اپنا راج اور طاقت برقرار رکھنے کیلئے جاگیردار طبقہ اپنی من پسند جمہوریت لاگو کرتا ہے۔ اس جاگیردار طبقے کی جمہوریت نے ہمیشہ جمہور کا ہی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ جموریت صرف جاگیردار اور مالدار طبقے کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ اس جاگیردارانہ جمہوریت میں خطے کی غریب جمہوریت کے لیے پھوٹی کوڑی تک موجود نہیں۔

> "ہمارے ہاں جاگیرداری نظام اتنا مضبوط ہے کہ وہ جمہوری نظام کی جڑ لگنے ہی نہیں دیتا۔ سچی بات تو یہ کہ جاگیرداری نظام اس معدے کی طرح ہے جو جمہوریت کو ہضم کر ہی نہیں سکتا۔"3

دولت کی فراوانی سے ان میں بہت سے اخلاقی اور معاشرتی جرائم بھی پائے جاتے ہیں۔ اغوا برائے تاوان، زناکاری، زنا بالجبر، طوائفوں سے تعلقات، بکاؤ مذہبی افراد کے ذریعے اپنی ذات کو مذہبی بہروپ دینا اور دیگر اوچھے ہتھکنڈے ان کی زندگی کا دستور ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علاقے میں اپنی خود ساختہ حکومت قائم کر رکھی ہوتی ہے، جہاں ان کی طاقت اور اختیار کا سکہ چلتا ہے۔ ایک ظالم جابر حکمران کی طرح اپنے ارد گرد کے کمزور طبقے پر اپنی طاقت دا اختیار کو استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کی مخالفت کرے یا ان کے آگے سر نہ جھکائے تو اس کو بقیہ زندگی ان جاگیرداروں کی عدالت یا جیل میں گزارنی ہوتی ہے۔

"ان کسانوں کو بیڑیوں میں باندھ کر نجی جیلوں میں رکھا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فرار ہوتا ہے تو اس کی سزا اس کے اہل خانہ کو دی جاتی ہے۔ جن میں جسمانی تشدد، قتل اور عورتوں کی بے حرمتی کرنا شامل ہوتا ہے۔"4

ان جاگیرداروں نے اپنا ایک سامراجی نظام قائم کر رکھا ہے۔ حکومت سے لے کر مقامی سطح تک ہر جگہ انہوں نے اپنی دہشت قائم کر رکھی ہے۔ اسمبلی ہالوں میں بھی انہی کی بھرمار ہے۔ احکام بھی انہی کے اور قوانین بھی انہی کے ہیں۔ علاقائی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر ہر معاملہ ان کی مرضی کے مطابق انجام پاتا ہے بلکہ جو ان کی مرضی ہوتی ہے وہی قانون ہوتا ہے۔ آفاقی اور مذہبی قوانین بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ جنوبی پنجاب کو زرعی اور جاگیردار اثرات کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

الف: جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول! منتخب افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ۔

ب: جنوبی پنجاب میں جاگیرداری نظام کے خلاف مزاحمت! منتخب افسانہ نگاروں کا تجزیاتی مطالعہ۔

الف: جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول! منتخب افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ

اس خطے کی زیادہ تر آبادی دیہات پر مشتمل ہے اور کثیر لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ یہاں کے کسان سخت محنت کر کے غلہ اناج اگاتے ہیں جو پورے خطے کی آبادی اور ملکی غذائی ضروریات کے کام آتا ہے۔ ان کسانوں کی حیثیت ملک بالخصوص جنوبی پنجاب کے معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ اگر کسان خوشحال اور سماجی طور پر محفوظ ہو گا تو یقیناً یہ پورا خطہ خوش حال ہو گا۔ اگر کاشتکار مختلف مسائل میں الجھے گا تو پورا خطہ زرعی اجناس، غذائی ضروریات کے حوالے سے کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں کے کسانوں کو مقامی سطح پر کوئی سہولیات میسر ہیں اور نہ ہی حکمرانوں نے کسان دوست پالیسیاں مرتب کی ہیں۔ قدرتی آفات، موسمیاتی تبدیلیوں اور سیلاب کی وجہ سے عام کسانوں کی فصلیں ہر سال ضائع ہو جاتی ہیں۔ ان چھوٹے درجے کے کسانوں کے پاس نہ تو کوئی ایسی ٹیکنالوجی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی فصلوں کا دفاع کر سکیں اور نہ ہی حکومت کی طرف سے کچھ بہتر یا ان آفات کے سد باب کے لیے کوئی انتظامات ہوئے ہیں۔

"The agriculture sector is the backbone of Pakistan's economy and is facing great challanges due to climate change impacts and extreme events. Variations in rainfall Patterns and changes in the diurnal temperature, timing of sowing and harvesting, availability of water and vaportranspiration losses could Pottentially impact Pakistan's crop Productivity." 5

کاشتکاروں کو مختلف سیاسی، سماجی اور زرعی مسائل میں الجھایا جاتا ہے۔ خصوصاً محکمہ آبپاشی اور محکمہ مال کے اہلکاروں کا باہمی گٹھ جوڑ کاشت کار کو تباہ کر رہا ہے۔ پٹواری، تحصیل دار، قانون گو اور محکمہ انہار کے ایکسئن وغیرہ دونوں ہاتھوں سے کاشتکار کو لوٹ رہے ہیں۔ مضبوط نہری نظام ہونے کے باوجود یہاں کے کسان کو فصلوں کے لیے پانی میسر نہیں۔ اپنے کھیت کے پانی کا وقت مقرر کروانے کے لیے پہلے پٹواری کے پاس جاؤ۔ پٹواری نے اس کام کے لیے رشوت کے نرخ طے کر رکھے ہیں۔ جس کے پاس مطلوبہ قیمت نہیں اس کے لیے پانی کا کچھ بھی حصہ نہیں اگر وہاں سے کسی طرح کامیاب ہو گیا تو محکمہ انہار کے اہلکار رشوت کے حصول کے لیے کاشتکار کو اپنے جبڑوں میں پھنسا لیتے ہیں۔ بڑی نہروں سے نکلنے والے ندی نالوں کو بغیر کسی وجہ کے بند کر دیا جاتا ہے۔ جب کاشتکاروں کی فصلیں پانی کے بغیر تباہ ہونے لگتی ہیں تو محکمہ انہار کے اہلکار پورے علاقے سے جبری بھتہ لینے کے بعد ندی نالوں کا پانی جاری کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک پٹواری کے پاس کاشتکار کی فصلوں سے باقاعدہ طور پر حصہ نہیں پہنچتا وہ بھی اسے مختلف مسائل گھن چکر بنائے رکھتا ہے۔ اگر کسی حوالے سے پٹواری سے کام پڑ جائے تو سیاسی وابستگیوں، دیہاتوں کی گروہ بندیوں اور ظالموں کی آشیر باد حاصل ہونے کی وجہ سے چھوٹے درجے کا کسان کاشتکار اپنے معاملات میں مکمل ناکام رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

یہ پٹواری حضرات حکومتی آبیانہ لیتے ہیں مگر جب آڈٹ کا وقت آتا ہے تو حساب کتاب دینے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو مطلق العنان بادشاہ تصور کرتے ہیں جو خود کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا۔ عام کاشتکاروں یا چھوٹے درجے کے کسانوں سے آبیانہ وصول کرتے ہیں مگر جاگیرداروں کے غلام بنے رہتے ہیں۔ ان کے اشاروں پر علاقائی زرعی نظام میں اکھاڑ پچھاڑ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر راشدہ قاضی نے پٹواریوں کی بدعنوانیوں کو اپنے افسانہ "گھونسلہ" میں نہایت واضح انداز میں بیان کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سر! محکمہ انہار والے ہیں ہم لوگ۔ تو پھر۔۔۔؟ اب یہ مجھ پر چھوڑ دیں سر! ایک کٹ ہی لگانا ہے اور۔۔۔۔ خیال کرنا سنا ہے نیا ڈی ڈی او آر آ رہا ہے۔ ہاں! یہ بھی سنا ہے کہ کافی کھڑوس آدمی ہے میں نے دیانت دار سنا ہے پھر۔۔۔ سارے جمع بندیاں اور کھاتے درست کر لو۔ یار! یہ ڈی ڈی او آر سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا نہیں سمجھتے کہ پٹواری علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے بادشاہوں سے بھی کبھی کسی نے کچھ پوچھا۔ یہ تو سچ ہے۔"6

زرعی لحاظ سے اس خطے میں درست اصلاحات رائج کی جائیں تو یقیناً ملکی معیشت بہتر ہو سکتی ہے۔ بہتر زرعی پالیسیوں سے غذائی ضروریات میں یہ خطہ خود کفیل ہو سکتا ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے زراعت کے شعبہ میں بہتر سہولیات دی جائیں تو فصلوں کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ جس سے نہ صرف جنوبی پنجاب کی غذائی

ضروریات پوری ہوں گیں بلکہ برآمدات کے ذریعے قیمتی زرمبادلہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں زرعی اصلاحات کی طرف سے بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر تھوڑی بہت اصطلاحات اس شعبہ میں ہوئی بھی ہیں تو عام اور چھوٹے کاشتکار اس سے مستفید نہیں ہو پاتے۔ صرف بڑے زمیندار یا جاگیر دار ہی اس سے مفاد حاصل کرتے ہیں۔ چھوٹے کسان کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ کھیتی باڑی کے جدید آلات خرید سکیں۔ دوسرے انہیں کھاد، بیج وغیرہ وقت پر مہیا نہیں ہوتے۔ اگر مہیا ہو بھی جائیں تو اس قدر مہنگے ہوتے ہیں جو ان کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔ نتیجتاً وہ قرض لے کر اپنی کھیتوں میں بوائی اور کھاد بیج کا انتظام کرتے ہیں۔ فصل ابھی کھیت میں پڑی ہوتی ہے کہ قرض خواہ اپنا قرض لینے کے لیے کسان کے پاس آجاتے ہیں۔ فصل کا منافع تو قرض خواہ لے جاتے ہیں اور کاشتکار خالی ہاتھ گھر آجاتا ہے۔ اس کے پاس اگلی فصل کی کاشت کے لیے اسباب مہیا نہیں ہوتے جس کی وجہ سے پھر قرضہ لینا پڑ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی عوامل ہیں جو چھوٹے کاشتکاروں کو مسلسل نقصان میں رکھتے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ فصل کی بوائی کے وقت کھاد بیج کا انتہائی مہنگا ہونا۔

۲۔ کھاد بیج کا میسر نہ ہونا یا بلیک پے ملنا۔

۳۔ آب پاشی کے لیے دریائی پانی کی عدم دستیابی۔

۴۔ جدید زرعی آلات کا نہ ہونا۔

۵۔ اسپرے کی ادویات کا انتہائی مہنگا ہونا۔

۶۔ حکومت کی طرف سے گوشوارہ جات کی بھرمار۔

۷۔ سیلاب کی وجہ سے ہر سال کھیتوں میں کھڑی فصلیں برباد ہو جانا۔

۸۔ جب فصلیں پک کر تیار ہو جائیں تو حکومت کی طرف سے گندم، چاول، گنا وغیرہ کی قیمتیں کم ہو جانا۔

یہ سب عوامل کاشتکار کی کمر سیدھی نہیں ہونے دیتے۔ بڑے زمیندار/جاگیرداروں کو حکومتی مراعات بھرپور طریقے سے میسر ہوتی ہیں کیوں کہ جاگیرداروں کا رابطہ مسلسل سیاست دانواں سے رہتا ہے اور خود بھی سیاست میں دخیل ہوتے ہیں۔ حکومتی مراعات چھوٹے کسانوں تک پہنچنے ہی نہیں دی جاتیں۔ چھوٹے کاشتکاروں کو زرعی پانی مہیا نہ ہونے کا سبب یہ جاگیردار ہیں، جو نہری پانی کا رخ اپنی زمینوں کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ چھوٹے کاشتکار دہائی دیتے رہ جاتے ہیں مگر ان کی فریاد پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ حتیٰ کہ محکمہ آبپاشی اور محکمہ مال کے اہلکار بڑے کاشتکاروں کی حاشیہ

برداری میں گم رہتے ہیں۔ جب بارشوں کا موسم ہو تو یہ سیلاب کے پانی کا رخ چھوٹے کاشت کاروں کی زمینوں کی طرف موڑ دیتے ہیں، جس سے بڑے زمیندار یا جاگیر دار اور ان کی فصلیں محفوظ رہتی ہیں۔ جب کہ چھوٹے کاشتکار اپنی جمع پونجی تک گنوا بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً بارانی اور پہاڑی علاقوں میں رود کوہوں کا پانی چھوٹے کاشتکاروں کی فصلوں کو ڈبو دیتا ہے جبکہ بڑے کاشت کاروں کا رقبہ محفوظ رہتا ہے۔ جنوبی پنجاب کی منفرد اسلوب رکھنے والی افسانہ نگار ڈاکٹر راشدہ قاضی اپنے افسانہ "کاروبار" میں زراعت سے وابستہ ایک چھوٹے کاشتکار کی سرگزشت بیان کرتی ہیں کہ کریما نامی شخص کو اپنی زمین کاشت کرنے کے لیے مسلسل قرض اٹھانا پڑتا ہے۔ لوگ اسے قرض دے دیتے ہیں کیونکہ اس کے بیٹے بیرون ملک مزدوری کرتے ہیں۔ اسی اعتماد کی بنا پر اسے قرض مل جاتا ہے۔ بیٹوں کی کمائی اور کاشت کاری کے باوجود اس پر قرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پریشانی و تنگ دستی کے اس عالم میں ہوتا ہے کہ اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر پاتا۔

> "اس بار تمباکو کی فصل بھی اچھی نہیں ہوئی۔ اوپر سے سیلاب آگیا لوگ سمجھتے ہیں بیٹے باہر ہیں تو بڑا پیسہ ہے۔ ادھار بھی دے دیتے ہیں۔ تو تو ادھار پہ آگیا وسایا۔ ہاں کریمے !11 لاکھ ادھار لے چکا ہوں اور آگے بھی پتہ نہیں کتنی بار لینا پڑے تو پھر کیا سوچا ہے وسایا۔ ابھی تو یار کریمے !2 لاکھ اور ادھار لینے کا سوچ رہا ہوں۔ گھر مرمت کروانا ہے زمین کے معاملات سیدھے کرنے ہیں۔"7

اس خطے میں کہیں سر بفلک کہسار ہیں تو کہیں وسیع و عریض میدان۔ کہیں سطح مرتفع ہے تو کہیں لق ودق صحرا موجود ہیں۔ قریباً سبھی علاقوں میں انسانی آبادی موجود ہے۔ یہ بھی پاکستان کے وسائل پر اتنا حق رکھتے ہیں جتنا ملکی اقتدار پر قابض اشرافیہ حق رکھتی ہیں۔ شہری اور میدانی علاقوں میں تو حکومت کچھ نہ کچھ توجہ دیتی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی تعلیم، صحت کی سہولیات اور زرعی مراعات فراہم کرتی ہے مگر دور دراز کے پہاڑی اور صحرائی علاقے مکمل طور پر ان سہولیات سے محروم ہیں۔ خصوصاً جنوبی پنجاب کے صحرائی علاقے حکومت کی عدم توجہی کا شکار ہیں۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات کے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ علاوہ ازیں آب پاشی اور پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں ہے۔

ان علاقوں کے لوگوں کی زندگی اور کاشتکاری کا دارومدار بارانی پانی پر ہے۔ اگر بارشیں ضرورت کے مطابق ہو جائیں تو ان علاقوں کی فصلیں لہلہانے لگتی ہیں اور لوگوں کو بھی پینے کا پانی میسر ہو جاتا ہے۔ جب کبھی بارشیں نہ ہوں تو یہاں کے باسی قطرہ قطرہ پانی کو ترس جاتے ہیں۔

چرند پرند تو کیا انسان بھی پیاس سے بے حال ہو جاتے ہیں۔ ارباب اقتدار کو ان کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جیسے یہ لوگ اس خطے کے باشندے نہیں۔ ایک طرف تو حکمران اپنے پینے کے لیے پانی اور دوسری غذائی ضروریات دوسرے ممالک سے درآمد کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف ان صحرائی خطوں میں انسان اور جانور ایک ہی جوہڑ سے پانی پینے پر مجبور ہیں۔ وسائل کی یہ تقسیم انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ دردانہ نوشین خان نے اپنے افسانہ "فروماندگی" میں صحرا نشین لوگوں کے ان مسائل کو قلم بند کیا ہے۔ جس میں وہ کہتی ہیں کہ جنوبی پنجاب رہنے والے بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے بوند بوند کو ترس جاتے ہیں۔ حتی کہ جانور تو کیا انسان بھی پیاس سے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ مگر ارباب اقتدار کو ان کی زبوں حالی کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اقتباس دیکھیے۔!

> "ہماری وستی ایک پیاسا کتا جانے کتنی کوس سے ہانپتا آیا تھا اور آ کے پانی پیتے ہی گر گیا ---اسی وقت مر گیا۔ "وھی --- تم کتے کی بات کرتی ہو۔ ہم نے بندے پیاس سے مرتے دیکھے ہیں--- جانوروں کی گھاس کمیاب ہو گئی۔ بستی کا ایک کتا گرمی سے دیوانہ ہو کر بھیڑ کو کاٹ گیا۔ بھیڑ اذیت ناک طریقے سے اچھل اچھل کر جھاگ نکالتی مری ۔کتے کو ڈنڈوں سے مارنے کا عمل اپنی جگہ قابل نفرت تھا۔ ہرے کھیت جو رنگ رواں میں امید کا قطرہ تھے پانی کی عدم دستیابی سے مایوسی کے خاکستری غبار میں اٹ گئے۔ "8

اس علاقے کے لوگوں کو جان بوجھ کر اس طرح کے حال میں رکھا گیا ہے۔ اگر صحرائی علاقوں کے افراد کے لیے پینے کا پانی اور زراعت کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے دریائی پانی اور دیگر سہولیات میسر کرے تو ان علاقوں کے افراد نا صرف خوش حال ہو سکتے ہیں بلکہ وہ اپنی زمینوں کو قابل کاشت بنا کر زرعی اجناس کا حصول بہتر ہو سکتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے حالات کو دیکھتے ہوئے محمد مبشر خان اپنے مضمون "South Punjab is a victim of neglect" میں لکھتے ہیں:

> " Through efficient utilisation of all such human and natural resources, a little focous can enable south Punjab to help Pakistan increase its gross domestic product (GDP). This,in turm, will help Pakistan overcome the grave balance - of - payment problem and will also avert the possibility of default that we are currently believed to be facing." 9

بہترین زرعی پیداوار حاصل کرنے کے لیے نمکیات کی حامل زمین درکار ہوتی ہے ،یعنی ایسی زمین جہاں فصلوں کو نقصان دینے والے معدنی اجزانہ ہوں۔ جیسے زمینیں ریتلی ہوتی ہیں جن کی آب پاشی انتہائی مشکل ہوتی ہے۔ کیوں کہ

ایسی زمینیں پانی کو زیادہ دیر روک نہیں سکتیں۔ پانی فوراً جذب ہو جاتا ہے اور زمین خشک ہو جاتی ہے۔ کچھ زمینیں سیم زدہ ہوتی ہیں، جن میں نمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہر وقت پانی کھڑا ہونے یا پانی کی زیادتی کی وجہ سے ایسی زمینیں تعفن زدہ ہو جاتی ہیں، جہاں کاشتکاری ممکن نہیں ہوتی۔ اگر کاشتکاری کی جائے تو فصلیں نہ اگنے کے سبب ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ بعض زمینیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں تھور کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، نمکیات زمین کی سطح پر آ جاتے ہیں۔ جن سے زمین میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے ایسی زمینیں بھی کاشتکاری کے لائق نہیں رہتیں۔ جنوبی پنجاب میں ریتلی، سیم اور تھور زدہ زمینوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ جن کا سبب ان علاقوں کی زمینوں کو قابل کاشت بنانے یا زرعی لحاظ سے حکومت کی جانب سے مثبت اقدامات کا نہ ہونا ہے۔ ریتلی، سیم اور تھور زدہ زمینوں کو فصلوں کے لیے سازگار نا بنانے کے پیچھے حکومت جدید مشینری اور کاشتکاروں کو مطلوبہ آگاہی فراہم نہ کرنا ہے۔ اگر یہاں کے کسانوں کو زرعی خوشحالی کے لیے آسان، سستی اشیاء اور درست رہنمائی مہیا کی جائے تو وہ اپنی زراعت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس سے فصلیں اچھی ہوں گیں نا قابل کاشت رقبہ، قابل کاشت رقبے کے ساتھ مل کر ملکی معاشی ترقی میں مددگار ثابت ہو گا۔ لاکھوں ایکڑ اراضی غیر متوازن نمکیات اور معدنیات کی وجہ سے فصلیں دینے کے لائق نہیں رہیں۔ حفیظ خان نے اپنے افسانہ "آٹے کی عورت۔" میں ایک ایسے ہی چھوٹے کسان کا تذکرہ کیا ہے جو اپنی سیم تھور زمین پر انتھک محنت کرتا ہے، اپنی جمع پونجی تک اس میں لگا دیتا ہے۔ لیکن زمین کی بیماری سیم تھور سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ زمین اور فصل کی پیداوار کو بہتر کرتے کرتے اپنا مال و متاسب کچھ گنوا بیٹھتا ہے اور اس پر وقت اجل آ پہنچتا ہے مگر اس کے حالات نہیں بدلتے۔ پسماندگان کو قرض کے بھاری بوجھ کے سوا کچھ نہیں دے جاتا۔ خود تو راہی آخرت ہوتا ہے لیکن اپنی اولاد کو قرض کی دلدل میں دھکیل جاتا ہے۔ اس کے پاس اگر اپنی زمینوں کو بہتر کرنے کے لیے کوئی تدبیر یا جدید سائنسی سہولیات ہوتیں تو یقیناً وہ اس لاچاری، بے بسی سے زندگی نہ گزارتا اور نہ ہی اس کی اولاد خوف ناک مالی مسائل کا شکار ہوتی۔ اقتباس دیکھئے۔!

> "اگر ہوشیاری اور سمجھ داری سے کام لیتا تو ہماری طرح قدرت سے مقابلے کی نہ ٹھانتا اور سیم زدہ زمین کو بیچ کر یہیں کہیں کھیت خرید کر بس جاتا۔ لیکن وہ نہ مانا اور قدرت نے اسے عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ ساری زمین سیم و تھور سے بے کار ہو گئی اور کرموں، کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا، بیٹی کو بے آسرا چھوڑ دھرتی تلے جا سویا۔"10

اس سماج میں کسان کے لیے مختلف القابات استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن میں ایک لقب "ان داتا" ہے۔ کیوں کہ کسان یا کاشت کار ہی سماج کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے کو غذائی ضروریات اور شکم کی آگ کو سرد کرنے کے لیے سردی گرمی، دن رات، دھوپ چھاؤں تسلسل کے ساتھ جہد عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ زمین کا جگر

پھاڑ کر، دن رات سخت محنت کر کے زرعی اجناس اگاتے ہیں۔انہیں نا تو موسموں کی پرواہ ہوتی ہے نا ہی اندھیرے اجالے کا کچھ خیال۔ سخت موسمی حالات، طوفانی بارشیں، زوردار آندھیاں ان کے پاؤں کی زنجیریں نہیں بن سکتیں۔ یہی کسان انسانیت کی بھوک پیاس مٹانے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ طرح طرح کی غذائی اجناس اگا کر انسانیت کی بقاء کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ جو رزق ہمیں میسر ہوتا ہے یہ کوئی آسان طریقے سے ہم تک نہیں پہنچتا اس کے پیچھے کسان کی طویل جدوجہد ہوتی ہے۔

زمین کی ہمواری، بیجائی، سینچائی اور دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نشوونما کے لیے کوشش کرنا، فصلوں کی کٹائی سے لے کر کھیت سے منڈیوں تک پہنچانا۔ منڈیوں سے پھر ہم تک ایسے ہی کتنے مراحل میں ہو کر آتا ہے۔کسان یا کاشت کار سخت ریاضت سے گزرتا ہے تب کہیں جا کر اللہ کی یہ نعمتیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ کسان جو اس قدر جاں گسل محنت کے بعد فصلیں اگا کر معاشرے کی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے وہ خود اکثر بھوکے پیٹ رہتا ہے۔ اس کو حکومتی ٹیکسوں کی کثرت، دریائی پانی کا نہ ملنا، مہنگے کھاد بیج کی کمی یا پھر کھاد بیج مہیا کرنے والے ڈیلروں کی طرف سے ظالمانہ شرائط کا ہونا ہے۔

کسان کی ساری محنت کا ثمر حکومتی ٹیکسوں کی مد میں یا پھر سفاک ڈیلروں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کسان بے چارہ غربت وافلاس کی چکی میں پس جاتا ہے۔ فاقہ کشی اس کا مقدر ٹھہراتی ہے جنوبی پنجاب کے صاحب طرز افسانہ نگار جاوید اختر بھٹی، زبوں حالی کا شکار کاشتکاروں کا احوال اپنے افسانہ "تین اینٹیں" میں بیان کرتے ہیں کہ کسان کثرت سے غلہ اور اجناس اگانے کے باوجود بھوکے رہتے ہیں۔ فاقہ کشی کی وجہ سے نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ انہیں کھانے کے لیے پتھر، اینٹوں کے سوا کچھ میسر نہیں آتا۔ وہ غربت وافلاس اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر جاتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو۔!

> "آج گندم کی کٹائی مکمل ہو چکی ہے۔اس سال ملک کے کسانوں نے گزشتہ تمام برسوں سے زیادہ گندم پیدا کی ہے۔۔۔ لیکن تین پیٹ اب بھی خالی تھے۔۔۔ اگلی صبح ایک کھولی میں تین لاشیں تھیں اور تین اینٹیں۔۔۔ایک لاش مرد کی، دوسری لاش عورت کی اور تیسری لاش ایک بچی کی تھی۔ دو اینٹوں کی رنگت گندمی تھی اور ایک کی دودھیا تھی۔اینٹوں پر دانتوں کے نشان تھے۔ جیسے کسی نے کھانے کی ناکام کوشش کی ہو ۔ آج کسانوں کا میلہ ہے۔ علاقائی رقص ہو رہے ہیں۔ ریڈیو بار بار نغمے سنا رہا ہے اس سال کسانوں نے گزشتہ تمام برسوں سے زیادہ گندم پیدا کی ہے۔"11

جدید زرعی علم کی کمی اور حکومت کی طرف سے زراعت جیسے بڑے شعبہ میں کوتاہی کی وجہ سے آج جنوبی پنجاب پورے خطے میں مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ عوام الناس روٹی اور آٹے کے لیے ذلیل و خوار ہیں۔ غریب آٹے کے حصول میں کھڑے کھڑے دن گزارنے کے باوجود بھی دس کلو آٹے کا تھیلا نہیں لے پاتے۔ بھوک کی شدت اور حکومتی بدانتظامی کی وجہ سے روزانہ کئی لوگ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اگر زرعی لحاظ سے حکومت کی پالیسیاں کسان دوست ہوتیں تو آج یہ حالات نہ ہوتے۔ زراعت کے شعبہ میں کوئی اچھے اقدامات نہ ہونے اور زرعی اجناس کی پیداوار میں آئے روز کمی کو دیکھتے ہوئے جاوید ہاشمی کہتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "زراعت کا شعبہ بالکل ایک روائیتی انداز کی صورت میں زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس کو قطعاً اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن آج کے حالات جس طرف جا رہے ہیں اگر اس شعبے کو مزید نظر انداز کیا گیا تو پاکستان کی معیشت تو تباہ ہو ہی چکی ہے، آنے والے وقتوں میں پاکستان کے اندر قحط کے جو آثار پیدا ہوئے ہیں وہ طوفان کی شکل اختیار کر لیں گے۔"
> 12

اس علاقے کا کسان ہر دور میں مختلف مسائل کا شکار رہا ہے لیکن موجودہ دور میں بہت زیادہ بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ آج کاشتکار چاروں طرف سے مافیا کا ہدف بنا ہوا ہے۔ جو کسان کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔ کسان کے لیے کھیتی باڑی مشکل بنا دی گئی ہے۔ جنوبی پنجاب کا زرعی ماحول اور کسان جن مسائل کا شکار ہے ان میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں۔

۱۔ کھاد مافیا

۲۔ شوگر ملز مافیا

۳۔ آٹا ملز مافیا

۴۔ آڑھت مافیا

۵۔ تیل مافیا

۶۔ سیڈ مافیا

یہ سب لوگ مختلف حیلوں سے کسان کا شدید استحصال کر رہے ہیں۔ یہ سب مافیا جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقے کی مختلف شکلیں ہیں۔ انہوں نے یہاں کے کسان کو جان بوجھ کر اس حال میں رکھا ہوا ہے۔ جاگیر دار طبقہ کسان کو

خوش حال اور خود مختار دیکھنا کبھی بھی پسند نہیں کرتا، اپنی طاقت ور اور استحصالی شعبدہ بازوں کی وجہ سے اس خطے کا غریب کسان مختلف مسائل اور قرضوں میں دبا ہوا ہے۔ اس کے حالات بہتر نہیں ہو رہے۔ جنوبی پنجاب کے زرعی اور جاگیر داری نظام کے بارے محمد حذیفہ الہیٰ اپنے مضمون "South Punjab- Neglect and Politicized " میں لکھتے ہیں:

"The social structure of south punjab is affected by feudalism. feudal landlords hold influence at the helm of agricultural or industruial Production. The landlords sustain a system of essentially slavery by creating dependencies for peasants who become subservient to the system. The peasants and temantsvote en masse for the landlord in elections. these landlords are called "electables"." 13

جہاں مختلف مافیاز نے کسان کو گھیر رکھا ہے وہاں سیڈ مافیا نے تو ات مچا رکھی ہے۔ بیجوں کا نرخ آسمان پر ہے۔ جس کا حصول کسان کے لیے کم و بیش محال ہوتا جا رہا ہے۔ اول تو بیج کی دستیابی بر وقت نہیں ہو پاتی بالفرض ہو بھی جائے تو بیج انتہائی ناقص معیار کے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے فصلوں کی پیداوار مناسب انداز اور متناسب مقدار میں نہیں ہوتی۔ فصلوں پر لاگت بڑھ جاتی ہے جبکہ فائدہ بہت کم یا پھر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بیج مافیا کا سب سے کاری حملہ کسان پر یہ ہوتا ہے کہ ادھار میں بیج فراہم کر کے اس کا بھاؤ اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرتے ہیں یا وہی پرانے بیج رنگ و روغن کر کے نئی بوریوں میں بھر کر کسان کے منہ پر مارے جاتے ہیں۔ مہنگے داموں اور ناقص بیجوں کی ترسیل سے کاشتکار اور اس کی فصلوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اگر کسان ان مافیاز کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ طاقت ور اور جاگیر دار لوگ حکومتی صفوں میں کافی اثر و رسوخ کے حامل ہوتے ہیں۔ پہلے تو کھاد، زرعی ادویات اور دیگر استحصالی نظریات کے حامل مافیاز نے جنوبی پنجاب کے کسان کو جکڑ رکھا تھا مگر اب سیڈ مافیا نے کسان کے استیصال میں سب کو مات دے دی ہے۔ زرعی ادویات، کھاد وغیرہ کے بھاؤ بڑھا کر کاشتکار کو نچوڑا جا رہا ہے۔ کسان کی اگائی ہوئی اجناس کو کم قیمت پر خرید کر دوبارہ اسے کئی گنا زیادہ مہنگا کر کے بیچا جاتا ہے۔ زراعت سے وابستہ افراد کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ علی تنہا نے جنوبی پنجاب کے مفلوک الحال کاشتکار کی بے بسی اور سیڈ مافیا کے استحصال ہتھکنڈوں کا واضح انداز میں پول کھولا ہے۔ ان کے افسانہ "بیج" میں سے اقتباس دیکھئے:

"اس نے ترازو ہوا میں الار کر نعرہ لگایا۔ غم نہ کر۔ بوری کا انتظام بھی کرتا ہوں۔ عمر دین دوڑتا ہوا اندر جا کر نئی بوری اٹھا لایا۔ لے! کیسی بوری دے رہا ہوں یار کو۔ اب پھٹ

جائے تو نصیب تیرا۔۔۔ عمر دین دور تک لمبے ڈگ بھرتے شفیع کو جاتا دیکھتا رہا۔ یہ تعجب خیز آدمی سال میں تین چار بار ہی آتا ہے۔ اس کی زمین کا یہی حال رہا۔ تو شفیع سمیت کہیں سب لوگ چلے ہی نہ جائیں۔"14

خطۂ جنوب میں زرخیز زمینوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے جہاں زمین فصلوں کے لیے اچھی ہے وہاں کسان کے لیے بہت سے مسائل ہیں۔ کسان کا کام بہت سخت ہوتا ہے کاشتکاری میں ہڈ حرامی اور رشوت ستانی نہیں ہوتی۔ کسان کو سستے بیج کا نہ ملنا اور اگر بیج ملتا بھی ہے تو اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت پر ملتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں چھوٹے درجے کے کسان کو سخت محنت کے باوجود اس کی محنت کا مناسب پھل اور اس کے بنیادی حقوق نہیں ملتے۔ اس سارے ماحول کی خرابی میں جنوبی پنجاب کا جاگیردارانہ نظام ہے۔ کیوں کہ سیاست اور معیشت پر اسی طبقے کی گرفت ہے۔ یہ لوگ ایسے قوانین پاس کرواتے ہیں جس سے صرف انہی جاگیرداروں بڑے بڑے زمینداروں کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ ملازم پیشہ لوگ اور چھوٹے کسان تو ٹیکس دیتے رہتے ہیں فوائد اور مال سب کچھ انہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لیے ہوتا ہے۔

"پانچ فیصد جاگیردار اسمبلیوں کی پچانوے فیصد نشستوں پر قابض ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی نظام آج بھی جاگیرداری کے حوالے سے چل رہا ہے ملک کا ہر قانون جمہور کی بجائے جاگیرداروں کے فائدے کے لیے بنتا ہے۔۔۔ یہی بڑے زمیندار اور جاگیردار فوج کے معاون رہے ہیں۔ انہی کے کندھوں پر سوار ہو کر فوج مارشل لاء لاگاتی اور چلاتی ہے۔"15

اس سرمایہ دارنہ نظام یا جاگیردارنہ نظام میں ان جاگیرداروں کو فوج کی پشت پناہی حاصل ہے کیوں کہ فوجی افسران کو بڑی بڑی جاگیریں ملتی ہیں۔ اب فوجی افسران بھی زمیندار یا جاگیردار ہونے کی وجہ سے اپنے ان جاگیرداروں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ ظالم جاگیردار کسی کو جواب دہ نہیں ہوتے۔ یہاں کی زراعت اور چھوٹے درجے کے کسان تنزلی کا شکار ہیں۔ دوسروں کے لیے سبزیاں، پھل، اناج وغیرہ اگانے والے کاشتکار خود عسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے جنوبی پنجاب ایک زرخیز خطہ ہونے کے باوجود آج زرعی لحاظ سے زوال کا شکار ہے اور یہاں کے کسان کاشتکار اس نظام کی وجہ سے بے بس و مجبور ہیں۔

ب: جاگیردارانہ نظام کے خلاف مزاحمت! منتخب افسانہ نگاروں کا تجزیاتی مطالعہ

جاگیر دارانہ نظام کے لیے انگریزی زبان کا لفظ feudalism استعمال ہوتا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام وہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام ہے جو جدید حکومتوں کے قیام سے پہلے یورپ اور ایشیاء کے ممالک میں جاری تھا۔ اس نظام میں بادشاہ کی طرف سے مختلف لوگوں کو ان کی خدمات کے صلے میں زمینوں کے وسیع رقبے جاگیر کے طور پر عطاء کیے جاتے تھے۔ یہ جاگیر دار اپنی جاگیر میں رہنے والے باشندوں کو مزارعین کے طور رکھتے تھے۔ زمین کا لگان وغیرہ خود جاگیر دار اپنے لیے وصول کرتے۔ محنت مزدوری دن رات کی کوشش کرنے والے مزارعین، نوکروں کو صرف زندہ رہنے کے لیے کچھ ملتا ورنہ وہ ان تمام فوائد سے محروم رہتے۔ انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا زوال، برصغیر میں علاقائی طاقتوں کی رنجشیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں سیاسی و معاشی لحاظ سے بلند ہونا وغیرہ تاریخی واقعات ہوئے۔ اس عروج و زوال میں یہاں کے مقامی لوگوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی قوم اور وطن سے غداری کی، دشمن کا ساتھ دیا۔ جس کے بدلے میں انہیں بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں۔

> "یہی طبقہ غیر ملکی تسلط کی اساس بن کر ان کے مفادات کو تادم آخر تحفظ دیتا رہا اور اس کے عوض جہاں منہ مانگی مراعات وصول کیں وہاں انگریزوں کے سیاسی تسلط میں بھی تھوڑا بہت حصہ وصول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کے ان وفاداروں میں ان لوگوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا جو قیام پاکستان سے پہلے بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے تھے۔"16

مختلف لغات میں "Feudalism" کے معنی یہ ہیں۔

اردو انگلش ڈکشنری کے مطابق:

> "Feudalism: نظام جاگیر داری یا اس کے اصول، طریقہ جاگیر داری، جاگیریت:، منصب داری تعلقہ داری وغیرہ۔"17

قومی اردو، انگلش ڈکشنری کے لحاظ سے:

> "Feudalism: جاگیر دارانہ، تعلقہ داری، عہد وسطہ کا جاگیر داری نظام اور اس کی خصوصیات، زمین کی مورو ثیت کا نظام، زمینداری، وڈیرہ شاہی۔"18

The new Encyclopadia Britannica میں تعریف اس طرح بیان ہے:

> " Feudalism is the mamorial or seignorial system in which landlords exercise over the unfree peasantry a wide variety of police, judicial and other rights." 19

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ایک اسلامی جمہوری مملکت کے طور پر دنیا کے نقشے پر وجود میں آ گیا۔ ایسا ملک جہاں لوگوں کو ان کے بنیادی انسانی حقوق میسر ہوں گے لیکن بانی پاکستان کی وفات کے بعد ہی یہ ملک جاگیر داروں کی گرفت میں آ گیا۔ فوج کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ ہو گیا جس کی وجہ سے یہ جاگیر دار، سرمایہ دار مزید مضبوط ہو گئے۔ خطہ جنوبی پنجاب میں یہ لوگ مختلف صورتوں میں چھائے ہوئے ہیں۔ اس پورے خطے میں ان لوگوں کا راج ہے۔ یہاں کے لوگ انہی جاگیر داروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے۔ اس علاقے میں غربت، ظلم وجبر، سیاسی و معاشی حالات انہی لوگوں کی وجہ سے قائم ہیں۔ یہ جاگیر دار طبقہ مختلف صورتوں میں اس خطے پر حکمرانی کر رہا ہے۔

> ”کہیں یہ ملک ہے، کہیں راجہ، کہیں چودھری، کہیں نمبر دار یا ذیلدار، کہیں نواب تو کہیں صاحب اور سردار۔ لیکن مجموعی طور پر جاگیر دار کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔“20

یہ جاگیر دار سیاسی اور جمہوری نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن یہ پارٹیاں بدلتے رہتے ہیں، ان کو الیکشن لڑنا اور جیتنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ ان کی جاگیر یا علاقے میں رہنے والے لوگ انہی کے ظلم و جبر میں دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ الیکشن کے وقت وہ اپنے سرداروں، جاگیر داروں کو ہی ووٹ دیتے ہیں۔ اگر وہ ان کو ووٹ نہ دیں تو ان جاگیر داروں کے غضب کا نشانہ بنتے ہیں۔ غریبوں کی آواز سننے والا کوئی نہیں کیوں کہ یہاں کا سارا نظام انہی جاگیر داروں کے تابع ہے۔

> ”جاگیر دارانہ معاشرہ نے غریبوں کو خون چوسنے کے ہزار قرینے ایجاد کر رکھے ہیں۔ یہ اپنے اصول فرائض کو بھولے ہوئے فوجی جرنلز، ظالم جاگیر دار اور کرپٹ نوکر شاہی کا اتحاد ہے۔۔۔ غریب آدمی کو کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں اس لئے وہ قومی دھارے سے کٹ چکا ہے۔ وقت کے خدا، اس کے جسم اور روح پر قابض ہیں۔ تعلیم، قانون اور انصاف کے دروازے اس پر بند ہیں۔“21

سماج کے بگاڑ میں سب سے بڑا اور خوف ناک بگاڑ طبقاتی فرق سے جنم لیتا ہے۔ دولت کے اعتبار سے اس سماج میں دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا، کھانے کو روٹی اور رہنے کو سائبان تک میسر نہیں۔ یہ غریب اور مفلوک الحال طبقہ ذلت و پس ماندگی کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ دوسرا طبقہ موروثی دولت مند اور جاگیر دار طبقہ ہے۔ جن کے پاس دولت کے انبار ہیں۔ یہ جاگیر دار اپنی دولت کو خرچ کرنے کے لیے طرح طرح کے انوکھے اور گھناؤنے شوق رکھتے ہیں۔ یہ اپنی دولت و دہشت کے بل بوتے پر طرح طرح کے اخلاقی جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہ اپنی سماجی و سیاسی طاقت سے ہر طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ قانون اور انصاف ان کے در کی غلامی کرتا ہے۔ یہ جاگیر دار طبقہ خود کو عام طبقہ کے افراد سے برتر و اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ یہ غریب، مفلوک الحال لوگوں

کو اپنا زر خرید غلام تصور کرتے ہیں۔ عام آدمی کی ان کی نگاہوں میں کچھ عزت نہیں ہوتی۔ جیسے چاہیں یہ غریب طبقے کے افراد سے کھلواڑ کرتے پھریں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جاگیرداروں نے اس خطے میں ایسا من چاہا نظام قائم کیا ہوا ہے کہ جس میں وہ بد عنوانی اور غریبوں کا معاشی استحصال کھلے عام کرتا ہے۔

> "جاگیر دار نے ایسے کلچر کو جنم دیا کہ جس نے اس نظام کے تحفظ میں اس کی پوری پوری مدد کی۔ اس کلچر کی بنیاد معاشرے میں فرق اور امتیاز کو برقرار رکھنا تھا کیونکہ جب تک جاگیر دار طبقہ خود کو دوسروں سے ممتاز نہیں کرتا اس وقت تک اس کے لیے معاشرے میں عزت و وقار قائم کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا جاگیر داری کلچر میں ان روایات اور اقدار کو فروغ ملا کہ جنہوں نے عوام اور خواص میں زیادہ سے زیادہ فرق کو قائم کیا۔" 22

اکثر جاگیر دار اپنی راتیں رنگین کرنے کے لیے مختلف کوٹھوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی خوب صورت چہرہ نظر آیا، اسے اپنی حرم سرا کی زینت بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ اس کام کے لیے ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی دولت ہوتی ہے۔ کچھ جاگیر دار عمر کے لحاظ سے سن رسیدہ ہوتے ہیں مگر اپنی شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے خوب صورت، نو عمر لڑکیاں بغل میں دبائے پھر رہے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ارد گرد کے قریبی علاقوں میں کسی بھی غریب کی نوجوان خوب صورت بیٹی نظر آئے تو اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں ستم بالائے ستم تو یہ ہے اگر ان کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی کوشش کرے تو ہمیشہ کے لیے اسے خاموش کرا دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کچھ دے دلا کر اس کا منہ بند کرا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ان کی شہوانی خواہشات کا نشانہ ان کے گھر میں کام کرنے والی خوب رو نوکرانیاں ہوتی ہیں جاگیر دار گھرانے کے تمام افراد اپنی اپنی باری سے ان خواتین سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ اگر کسی خاتون کی کوکھ میں ان کی نشانی پرورش پانے لگے تو اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

یہ طبقہ عورت کو محض جنسی کھلونا سمجھ کر اس کا استحصال کرتا ہے۔ دولت کی طاقت پر یہ جاگیر دار، سرمایہ دار چار چار شادیاں کرنے کے باوجود اپنی جنسی وارداتوں کے لیے مختلف شہریوں میں گھر بنا رکھے ہوتے ہیں جہاں یہ اپنی راتیں رنگین کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ان کے اپنے گھر کی خواتین سارے جہاں سے زیادہ باعزت، باوقار ہوتی ہیں۔ معاشرے کے کسی فرد کو اجازت نہیں ہوتی کہ ان کی عورتوں کو نظر بھر کے دیکھ سکے۔ سات پردوں میں ملفوف رہتی ہیں یہ جاگیر دار خود تو جہاں چاہیں اپنی جنسی ہوس کے لیے منہ مارتے پھریں مگر ان کی بیٹیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا کوئی حق نہیں اگر عوام میں سے کوئی ان کے گھر کی بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات بھی کرے تو وہ آنکھیں نوچ دی جاتی ہیں۔ ان کے گھر کی کوئی خاتون اپنی پسند سے شادی کر لے تو یہ ان کے لیے عزت وانا سے زیادہ زندگی

موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہ جاگیر دار اپنے خاندان کی،ان کے مطابق باغی عورتوں کو کبھی معاف نہیں کرتے ان کو قتل کروادیتے ہیں۔

جاگیرداروں کے انہی بھیانک اور وحشیانہ رویوں کے بارے ڈاکٹر راشدہ قاضی اپنے افسانہ ''سوالیہ نشان'' میں ایک ایسے ہی جاگیر دار کی کہانی بیان کرتی ہیں جو اپنی جنسی تسکین کے لیے نہ تو گھر کی نوکرانیوں کو چھوڑتا ہے اور نہ ہی کہیں پے نظر آنے والی خوب صورت عورت کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔ مگر جب اپنی بیٹی کسی سے پسند کی شادی کرتی ہے، معلوم ہونے پر اس کو مروادیتا ہے۔

> ''چھوٹے مالک کی شادی اس کی چچازاد سے کر دی جاتی ہے جو والدین کی اکلوتی اولاد ہے اور کئی مربعوں کی تنہاوارث ہے وہ چھوٹے مالک سے سات سال بڑی ہے مگر عمروں کے اس فرق کو درمیان میں نہیں لایاجاتا۔۔۔ جیسے مجھے چھو کر انہوں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر لیا ہو مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں کوئی مقدس کتاب ہوں جسے غلاف در غلاف لپٹا رہنا چاہیے۔ میں ان کے لیے یوڈی کلین کبھی نہیں بن سکتی۔۔۔ان کی مرغوب غذا باندیاں ہیں۔''23

جاگیر دار اپنی دولت کے نشے میں دھت ہو کر کسی اخلاقی، سماجی اور دینی قانون کو کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کا اصول صرف دولت ہوتی ہے، وہ خود کو ایک مطلق العنان حکمران تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو جائز، غریب کے جائز عمل کو بھی بغاوت سے تعبیر کر رتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے سیاسی نظام میں سب سے خوفناک ناسور جاگیر دارانہ نظام ہے۔ان دولت کے پجاری ظالم جاگیر داروں نے ہر جگہ اپنے پنجے گاڑھ رکھے ہیں۔ یہ طبقہ خود ہی پولیس، وکیل، بادشاہ اور جج ہوتا ہے۔ عزت، طاقت، مالک و مختار ہونا ہر طرح کے حقوق کا حاصل ہونا فقط ان کے لیے مخصوص ہے۔ علاقے کے سب لوگ انہی کی سرپرستی میں زندگی گزارتے ہیں۔ گویا سب لوگ ان کی رعایا اور وہ خود مختار بادشاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کبھی کسی غریب مزارع کو ان کے ظلم و جبر اور ناانصافیوں پر غصہ آجائے، وہ ان کے ستم کے خلاف کھڑا ہو جائے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔ یہ جاگیر دار مختلف طریقوں سے ڈرادھمکا کر یا تھانہ، جیل میں بند کرا کے عزت پر وار کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے خوشامدیوں، پولیس افسران اور دیگر تعلق داروں کو موقع فراہم کرتا ہے۔ جاوید اختر بھٹی نے اپنے افسانہ۔۔ ''کوتوال'' میں ایک جاگیر دار کا تذکرہ کیا ہے جو کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے مزارع کو جیل اندر کروا دیتا ہے۔ جب اس کی بیوی جاگیر دار کے پاس اپنے شوہر کی رہائی کے لیے آتی ہے تو نہ صرف خود اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر تا ہے بلکہ اپنے تعلق دار، ایک حرام کار پولیس افسر کو پیش کر دیتا ہے، جو اسے مختلف بہانوں، شرائط سے فریب دے کر اپنے گھر لے آتا ہے۔ اس سے نہ صرف اپنے گھریلو کام کاج کرواتا ہے بلکہ اس سے ناجائز تعلقات قائم کرتا

ہے۔ آخر کار جب اس خاتون کا شوہر رہا ہو کر آتا ہے، حقیقت معلوم ہونے پر وہ اس شہوت پرست تھانیدار کو قتل کر کے اپنی بیوی کو اس کے چنگل سے نجات دلواتا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔!

"لڑکی تم تھانے دار کی بیوی ہو؟ اس عورت نے غور سے بوڑھی اماں کو دیکھا اور کہا۔ اماں! میں تھانیدار کی بیوی نہیں اس نے زبردستی مجھے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔ اس سے تم اپنے خاوند کو بچا سکتی ہو۔ وہ رئیس تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ اس نے کہا وہ ایسے کہ تم میرے پاس رہو گی۔ کھانا پکا دینا اور کپڑے دھو دینا بس۔ میں تھانیدار کے پاس رہنے لگی اور اس کی بیوی مشہور ہو گئی۔۔۔ تھانیدار نے کہا میں نے بہت کوشش کی مگر وہ رئیس بہت با اثر آدمی ہے۔ تھانہ کچہری میں اس کی بہت واقفیت ہے۔ لیکن میں نے اپیل کی کہ وہ ضرور باہر آجائے گا تم فکر نہ کرو۔ مگر وہ پانچ سال تک باہر نہ آیا۔" 24

اس پورے خطے کو جاگیر داوں نے اپنی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف جس نے بھی بولنے کی جسارت کی تو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ اس کو اپنی عدالت میں مروادیں یا چاہیں تو اپنے راتب خور، خوشامدی پولیس افسران کے ذریعے ناجائز مقدمات میں پھنسا کر جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند کروادیں۔

"فیوڈل لارڈ حلقہ پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہر اقتدار میں شامل ہوتا ہے۔ وہ اقتدار خواہ مغلوں کا ہو، سکھوں کا ہو، انگریزوں کا یا کالے انگریز کا۔ حلقے پر گرفت کے لیے وہ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرتا ہے، مگر اپنے لوگوں میں اس نظریے کا پرچار کرتا ہے کہ دھڑا دین سے بھی پیارا ہونا چاہیے، تھانہ، تحصیل پر کنٹرول اس کی پہلی اور آخری ترجیح ہوتی ہے۔" 25

جتنی منافقانہ روش دولت مند اور جاگیر دار طبقے میں پائی جاتی ہے اتنا دوغلا پن سماج کے کسی طبقے میں نہیں پایا جاتا۔ خود کو اشرافیہ کہلوانے والے یہ جاگیر دار، وڈیرے کردار و عمل کے لحاظ سے بہت ہی بدبودار ہوتے ہیں۔ جب ان کے چہروں سے شرافت کا مکھوٹا اترتا ہے تو ان کی مصنوئی شرافت کی ملمع کاری بکھر جاتی ہے اور ان کا اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ جہاں ان کے مختلف گھناؤنے مشاغل ہوتے ہیں وہاں جنسی حرص ان میں انتہائی درجے کی پائی جاتی ہے۔ یہ اپنی طاقت کی وجہ سے معمولی اور کم حیثیت افراد کے گھرانے کی عزتوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ شرافت کا لبادہ اوڑھے یہ غلیظ نسل کے لوگ انتہائی کمینے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے خواتین کو محض جنسی تسکین کا ذریعہ بنا رکھا ہوتا

ہے۔ان کے لیے عورت صرف استعمال کی چیز ہے جسے برت کر پھینک دیا جاتا ہے۔ان کے مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ ان کے مزارعین اور نوکر ہوتے ہیں۔ یہ ان کی خواتین کو جنسی حرص و ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ جاگیر دار طبقہ اپنی طاقت و دھونس کا استعمال کرتے ہوئے قریبی لوگوں کی مختلف خوبصورت خواتین سے شادی کرواکر، ان خواتین کو اپنی بد کرداری کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔اپنے ملازمین کو مختلف حیلوں سے یا جان کا خوف دلا کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ہوس پرست جاگیر داروں کے ان گھناؤنے افعال کا احاطہ کرتا ہوا حفیظ خان کا افسانہ ''منشا اور میاں منشا'' ہے جس میں میاں منشا نامی جاگیر دار کے پاس ایک نوکر ہوتا ہے جس کا نام بھی منشا ہوتا ہے، لیکن نام ایک جیسا ہونے سے تقدیر ایک جیسی نہیں ہو جاتی۔ منشا، میاں منشاء کا خادم خاص ہوتا ہے۔ جسے میاں منشاء کے ہر خواص و عام معاملے میں رسائی ہوتی ہے۔ میاں منشاء اپنی جنسی تسکین کیلئے علاقے میں موجود ایک خوبصورت لڑکی نسیم سے منشا کی شادی کروا دیتا ہے مگر اسے دلہن کے قریب نہیں بھٹکنے دیتا۔دن کے اجالے میں وہ دنیا کی نگاہ میں منشا کی بیوی کے طور پر رہتی ہے مگر رات میاں منشا کی آغوش میں بسر ہوتی ہے۔ منشا نامی یہ نوکر اپنی بے عزتی اور بے بسی پر کڑھتا رہتا ہے مگر وہ کچھ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔کچھ دنوں بعد میاں منشا کی نظر ایک اور حسین چہرے پر پڑی اور وہ اس حسینہ لڑکی کی شادی اپنے نوکر منشا سے فقط اس لیے کرا دیتا ہے کہ پہلے کی طرح بظاہر وہ منشا کی بیوی ہو گی لیکن در حقیقت وہ لڑکی میاں منشا کی راتوں کو رنگین کرے گی۔ منشا پہلے ہی سے بہت بے عزتی اور پریشانی کے عالم میں ہوتا ہے۔

وہ میاں منشا کے زنان خانے میں گھس کر اس کی بیوی سے تعلقات قائم کر کے انتقام لیتا ہے۔ پھر وہ اپنی بے بس زندگی سے انتقام لیتا ہے۔کیوں کہ اس کی دوسری بیوی بھی شادی کی پہلی رات میاں منشا کی بدبودار ہوس کا نشانہ بننے کے لیے اس کے کمرہ خاص میں پہنچ جاتی ہے۔جب نئی نویلی دلہن صبح واپس آتی ہے تو منشاء کی لاش اسے ملتی ہے، وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر چکا ہوتا ہے۔اس نے اپنی بے بس زندگی اور بیوی کو میاں منشاء کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے خودکشی کر لی۔جب وہ خود اس دنیا میں نہیں ہو گا تو میاں منشاء کس کی آڑ میں یہ گھناؤنا کھیل جاری رکھے گا۔اقتباس دیکھیے!

> "نکاح بھی ہوا اور نسیم ،منشے کے ساتھ رخصت ہو کر، میاں منشے کے ڈیرے سے تھوڑا ادھر ،اس کی کوٹھری میں آن بیٹھی آیا گیا ایک طرف ہوا تو میاں منشے نے ،منشے کو بلا بھیجا ---اس کی جگہ ادھر ہے ادھر ، میرے بستر پر۔اور خبر دار ،اسے چھوا بھی تو کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔"26

غریب بے چارے نوکر یامزارعین ان جاگیرداروں کے سامنے ان کے ظلم و جبر کی وجہ سے دب کر رہتے ہیں ان کے نزدیک یہ وڈیرے، جاگیرداران کی زندگی کے مالک و مختار ہیں۔ یہ جاگیردار چاہیں تو کسی غریب کے گھر میں چولہا جل سکتا ہے، فاقہ کشی نہیں آسکتی۔ اگر یہ نہ چاہیں تو کمزور غریب مزارعین کو ایک دانہ بھی میسر نہ آئے۔ یہ عیاش جاگیردار طبقہ غریب مزارعین اور نوکروں کی جس بہو بیٹی کو چاہیں استعمال کر کے بے کار چیز کی طرح پھینک دیں، جس کو چاہیں اغوا کروا کر گم کر دیں۔ کسی میں تاب نہیں کہ ان کے خلاف کھڑا ہو سکے انہوں نے نظام ہی ایسا بنایا ہوا ہے کہ یہ جو چاہیں کرتے پھریں لیکن ان کو کوئی کسی طرح سے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

> " Land lords are beneficiaries of a broken system that exploits the poor and empowers the rich. Consequently , their desire to do away with this (system) is very limited, and their private beliefs of dominance , such as supperssion of women , continue to exist . " 27

انسانیت کی جتنی تذلیل جاگیردار کرتے ہیں اتنی تذلیل مطلق العنان حکمران بھی نہیں کرتے۔ یہ اپنے پاس خدمات انجام دینے والے مختلف افراد سے بہیمانہ سلوک کرتے ہیں۔ یہ جاگیردار طبقہ نوکروں کو اپنے جیسا انسان تصور ہی نہیں کرتا۔ مزارعین یا نوکروں کی تذلیل کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ملازمین سے کوئی چھوٹی موٹی غلطی ہو بھی جائے تو ان کو ڈرانا دھمکانا، تشدد کا نشانہ بنانا، تھانہ و جیل کا ڈراوا دینا روزمرہ کا معمول ہوتا ہے۔ یہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں کو انتہائی گھٹیا اور کم تر سمجھتے ہیں۔ اپنے نوکروں کو ان کے حقیقی نام سے بلانے کی بجائے حقارت آمیز، گھٹیا ناموں سے پکارتے ہیں۔ مہمانوں کے سامنے بھی ان کو مارنا پیٹنا، ذلیل کرنا ان جاگیرداروں کا روز و شب کا وطیرہ ہوتا ہے۔ ملازمین کی عزت نفس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ غریب ملازمین کی تذلیل کر کے جیسے وہ محظوظ ہوتے ہیں۔ ان جاگیرداروں نے بطور خاص اپنے ظلم و تشدد کا اور تضحیک کا ہدف بنا رکھا ہوتا ہے۔

یہ لاچار و مجبور ملازمین اس ظلم و ستم کو اپنا مقدر سمجھ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیوں کہ یہ قانون کے رکھوالوں کو اپنا بغل بچہ بنائے رکھتے ہیں۔ قانون کے رکھوالے افسران ان سرداروں، وڈیروں کے ہاں دعوت شیراز اڑاتے پائے جاتے ہیں۔ جاگیردار طبقہ خود کو خشک و تر کا مالک سمجھتا ہے، رعونت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا ہوا ہے۔ ڈاکٹر لیاقت علی نے اپنے افسانہ "کرم داد بھی" میں جاگیرداروں کے ان اوچھے کرداروں کو بیان کیا ہے۔ جس میں ایک جاگیردار جو نمبردار کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ وہ اپنے نوکروں اور مزارعین کی بے حد تذلیل کرتا ہے، حتیٰ کہ ان پر ظلم و تشدد کرنا، ان کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنا روزمرہ کا معمول بنا لیتا ہے۔

"ایک مرتبہ اس کے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا مگہ یوں پھسلا کہ پانی کے چند چھینٹے اڑ کر صاحب بہادر کے پتلون پر گرے تو وہ ایک دم چونکے۔ کرمو دیکھ تو سہی! صاحب بہادر کے منہ سے محض اتنا ہی نکلا تھا کہ نمبردار نے جیسے اس گستاخی کے فوری ازالے کے طور پر ایک زوردار ٹھڈا وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کرم داد کے منہ پر مارا اور وہ سنبھلتے سنبھلتے پیچھے جا گرا۔ اس کی دونوں ٹانگیں فضا میں آدھی بلند ہوئیں اور دھوتی کے دونوں پلو دائیں بائیں ایسے گرے کہ اس کے رانوں سے کولہوں تک بے ترتیب گھنے گچھوں ایسے بالوں کا ایک کریہہ منظر آس پاس بیٹھے مہمانوں کے لیے کوئی پر لطف لطیفہ بن گیا۔"28

طاقت، دولت اور اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے جنوبی پنجاب میں معاشرتی بگاڑ اور اخلاقی عدم توازن کا سب سے بڑا سبب جاگیردارانہ نظام ہے۔ خود کو معاشرے میں نفیس اور شریفانہ کردار کے روپ میں پیش کرتا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ جاگیردار طبقہ ہر اخلاقی، سماجی اور قومی جرائم میں ناک تک گھسا ہوا ہے۔ دنیا کے سامنے یہ محب وطن، صاحب کردار دکھنے والا، وطن فروش، بدکردار اور بدطینت ہوتا ہے۔ بظاہر عزتوں کے محافظ دراصل عزتوں کے لٹیرے ہوتے ہیں۔ یہ جرائم اور گناہوں کی مخالفت کرنے والے بباطن خود گناہوں کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ چاہے جس مقام پے پہنچ جائے لیکن اپنی حقیقی خباثت سے دور نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے گھناؤنے مشاغل کے لیے بدمعاش فطرت لوگوں کی ایک فوج پال رکھی ہوتی ہے۔ جو ان کے غیر قانونی، غیر اخلاقی معاملات میں ان کی معاون ہوتی ہے۔

کچھ لوگ شوق سے تو کچھ لوگ مجبوریوں کی بنا پر ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ناجائز طریقوں سے کمائی گئی دولت کے انبار، ان کے غلیظ کاموں میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے ماتحت کام کرنے والے اکثر لوگ مجبوریوں کے باعث ان کا ساتھ تو دیتے ہیں در حقیقت ان کا ضمیر اس بات پر انہیں لعن طعن کرتا ہے۔ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے غیر قانونی، غیر اخلاقی معاملات میں ملوث ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ جاگیردار اکثر جنسی مریض ہوتے ہیں۔ اپنی ہوس کے لیے سو طرح کے انتظامات رکھتے ہیں۔

کئی کئی بیویاں، متعدد داشتائیں اس کے علاہ جہاں کہیں خوب صورت چہرہ دیکھا یا قرب وجوار میں کسی شریف آدمی کی جوان بیٹی دکھائی دی، اسے زبردستی اٹھوا کر اپنی خواب گاہ میں روند ڈالتے ہیں۔ ان جاگیرداروں کا زیادہ تر مشغلہ غیر قانونی کاموں کے ذریعے دولت کمانا ہوتا ہے۔ بظاہر حب الوطنی پر درس دینے والا یہ طبقہ، وطن دشمن معاملات میں آلودہ نکلتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے معتبر افسانہ نگار ڈاکٹر انوار احمد جاگیرداروں کے اس گھناؤنے اور دوغلے کردار کا احاطہ

کرتے ہوئے اپنے افسانہ گونگی غراہٹ میں حاجی خواجہ کے روپ میں بظاہر شریف انسان کے روپ میں دکھائی دینے والے جاگیر دار کی ریشہ دوانیاں طشت از بام کرتے ہیں۔ حاجی خواجہ جو پارسائی کا لبادہ اوڑھے ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ انتہائی گھٹیا کردار کا حامل ہوتا ہے۔ طوائفوں، داشتاؤں اور بیواؤں کے ساتھ ساتھ اپنی جنسی آگ بجھانے کے لیے بے کس و مجبور لوگوں کی بیٹیوں کو بھی اپنی درندگی کا نشانہ بناتا ہے۔ دیہات سے نکل کر شہر میں آنے کے باوجود شائستگی اس کے قریب نہیں پھٹکتی۔ یہ جاگیر دار شہروں میں آبسنے کے بعد بھی جاگیر داروں والے نجس طور طریقے جاری رکھتا ہے۔

"دراصل حاجی خواجہ سے کسی بھی قبول صورت عورت کی مجبوری اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔۔۔ انعام کی خاطر یہ خبر میں نے ہی اسے دی تھی۔ کہ ماسٹر بشیر کی چھوٹی بیٹی جوان ہو کر آپ کے وظیفے کی مستحق ہو گئی ہے۔ حاجی خواجہ نے اسی رات اسے اپنے محل میں منتقل کرنے کی ہدایت کی۔۔۔ سارے ٹرک بخیر و عافیت سرحد پار پہنچ چکے ہیں اور حاجی خواجہ بار بار اپنے اوور کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنے سوٹ کی ایک جیب میں موجود اس تقریر کو ٹٹول رہا تھا جو اسے قومی معیشت اور سمگلنگ کا انسداد کے موضوع پر ہونے والے مذاکرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کرنا تھی۔"29

ڈاکٹر انوار احمد جنوبی پنجاب بلکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک بہترین کہانی کار ہیں۔ وہ اپنے سماج پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے خطے میں ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشرتی لحاظ سے وسائل کو کہیں بیانیہ تو کہیں علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں دور جدید کے معاشی، مذہبی، اخلاقی جبر اور ارد گرد پھیلی منافقت سرمایہ داروں، جاگیر داروں نے اس خطے کی عوام کا جو استحصال کیا ہوا ہے یہ سب موجود ہے۔ ڈاکٹر لیاقت علی ان کے بارے لکھتے ہیں:

"ان کی کہانیوں میں واقعے کے طلسم سے زیادہ جملے کی کاٹ اثر رکھتی ہے۔ ان کے جملوں میں جبر کی اس فضا کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج میں موجود طبقاتی تفاوت اور استحصالی قوتوں کے خلاف بھی کڑا طنز دکھائی دیتا ہے۔۔۔ تاہم متکلم کے پیچھے دراصل افسانہ نگار کا وہ سماجی شعور بول رہا ہے جو بخوبی جانتا ہے کہ حاجی خواجہ ایسے کرداروں کے روز و شب کیسے گزارتے ہیں اور کس کس انداز میں نچلے طبقے کا استحصال کرتے ہیں۔"

30

ظلم و جبر اور لا قانونیت جاگیر دار طبقے میں انتہائی درجے میں پائی جاتی ہے۔ یہ معاشرے کے کمزور طبقات پر مظالم ڈھاتے ہیں، ان کا ہر طرح سے استحصال کرتے ہیں۔ یہ اپنی دولت و خوف کی بدولت لوگوں کے دل و دماغ کو دبائے رکھتے ہیں۔ قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ یہ قانون کو اپنے گھر کی لونڈی بنا کر رکھتے ہیں۔ بدکاری، شراب نوشی، اور کمزوروں پر ظلم و ستم ان کا شعار ہوتا ہے۔

یہ جاگیر دار طبقہ کبھی بھی اپنے جرائم کی سزا نہیں پاتا۔ قانون کے پھندے سے یہ صاف بچ نکلتے ہیں۔ جن لوگوں پر یہ ظلم و ستم کرتے ہیں، ان میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ ان کو قانون اور انصاف کے مطابق سزا دلوا سکیں ۔ کیوں کہ طاقت ور جاگیر دار طبقہ قانون کو اپنے لیے فقط مکڑی کا جالا سمجھتا ہے، جو دولت کی قوت سے پھاڑا جاتا ہے۔ یہ سردار، جاگیر دار، گناہ کر کے بھی پاک دامن رہتے ہیں، مظلوم ساری زندگی اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر تڑپتے رہ جاتے ہیں مگر ان کے لیے قانون بہرا اور انصاف اندھا ہوتا ہے۔ قانون و انصاف کی آنکھیں اور کان طاقت ور کو دیکھنے اور اسی کی آواز سننے میں ماہر ہیں۔ احمد اعجاز نے اپنے افسانہ "پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے" میں ایک ایسے ہی جاگیر دار کے بدقماش، شرابی بیٹے کا تذکرہ بیان کیا ہے جو دولت و طاقت کے نشے میں مدہوش ہوتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر گاڑی چلا رہا ہوتا ہے جس کے سامنے ایک کمزور، بے بس خاندان کا معصوم سا بچہ آ جاتا ہے۔ مدہوشی کے عالم میں اسے اپنی گاڑی کے نیچے کچل دیتا ہے۔ بچے کے ورثاء تڑپتے، پھڑ پھڑاتے رہ جاتے ہیں۔ پولیس اس جاگیر دار کے بدفطرت بیٹے کو گرفتاری تو کرتی ہے مگر عدالت سے اپنی دولت کے بل بوتے پر بے گناہ ہو کر رہائی پاتا ہے۔ غریب، مظلوم اور بے بس خاندان نہ صرف اپنے معصوم بچے سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ ذلت و خواری ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ پورے جنوبی پنجاب میں ان جاگیر داروں کا راج ہے یہ لوگ جب جیسے کریں ان سے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔

> "وہ گلی میں موجود لوگوں کے ہجوم میں سے ایک سے پوچھتا ہے۔ میاں! تاج دین کے بیٹوں نے فائرنگ کی ہے ان کا بھائی آج باعزت بری ہو کر ابھی گھر پہنچا ہے۔ قتل کے کیس سے چھوٹا ہے، خوشی سے فائرنگ نہ کریں دھمالیں نہ ڈالیں تو اور کیا کریں؟ ۔۔۔۔ معصوم کے بہن بھائی تڑپ رہے تھے، ماں بے چاری کی زبان پہ تو ایک ہی کلمہ تھا یہ بچہ میرا نہیں، وہ تو سکول گیا ہوا ہے اس کے بوڑھے اور کمزور باپ نے (کاش! باپ بوڑھے اور کمزور نہ ہوں) تھانوں اور عدالتوں کے محض دھکے ہی کھائے کہ وہی ہوا جو اس معاشرے میں ہوتا آیا ہے، سزا ملنے والوں کو عزت اور انصاف چاہنے والوں کو ذلت ملی۔"31

جاگیردارنہ نظام عوام الناس کے لیے بہت مسائل اور اپنے اندر خوف ناک پہلو رکھتا ہے۔ جنوبی پنجاب کا جاگیردار خود کو نعوذ باللہ خدا کے روپ میں دیکھتا ہے، احساس تفاخر اور سفاکی میں یہاں کے جاگیردار کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ خطہ جاگیرداروں کا اکھاڑہ بن چکا ہے۔ بلا شرکت غیرے جاگیردار طبقہ اس پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہاں غریب بے بسی، لاچاری، اور مظلومیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جاگیرداروں، سرمایہ داروں نے زندگی کی بنیادی ضروریات کی چیزوں پر مکمل تسلط قائم کر رکھا ہے۔ عوام الناس زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محال ہے۔ جاگیردار طبقہ غریب عوام کا ہر سمت سے استحصال کر رہا ہے۔ اگر اس خطے کی عوام غربت کے خلاف یا اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائے تو ظلم و جبر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ سردار، جاگیردار خود تو دولت کی ریل پیل میں زیست بسر کرتا ہے مگر غریب نان شبینہ کو بھی ترس رہا ہے۔

اگر کوئی شخص ان جاگیرداروں کے طے شدہ راستے پر نہیں چلتا تو اس پر درندگی و سفاکی کا ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے ان سرداروں نے جو شوق پالے ہیں، ان کی تکمیل کے لیے وہ کسی حد تک بھی گر جاتے ہیں۔ جو ان کی بات نہ مانے اس پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دیتے ہیں۔ ان سرداروں، جاگیرداروں کے طبقے میں ملا ہو ان کی کاسہ لیسی کرتا ہوا ایک اور طبقہ بھی ہے جو مفاد پرست مذہبی افراد پر مشتمل ہے۔ جن کا مذہب سے دور دور تک کا تعلق نہیں، وہ صرف عوام کے مذہبی اعتقادات اور مذہب سے ان کی محبت کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی رویوں کے نباض افسانہ نگار علی تنہا اپنے افسانہ کرونا کا تاج میں ایک ایسے سنگ دل، طاقت کے نشہ میں چور جاگیردار کا واقعہ تحریر کرتے ہیں، جو غریبوں پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے جبر کا وطیرہ اپنا لیتا ہے۔ ایک غریب آدمی نور اللہ پر فقط اس لیے ظلم و ستم ڈھاتا ہے کہ وہ اس سردار، جاگیردار کے ناجائز معاملات میں اس کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ اس غریب نوکر پر اس قدر ظلم کرتا ہے کہ اس کے بچنے کی امید باقی نہیں رہتی۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ جاگیردار فاخر گھوڑے پر بیٹھے کوڑے کے ذریعے اس غریب کارندے پر تشدد کرتا ہے۔ مار مار کر تھک جاتا ہے، نشہ میں دھت ہونے کی وجہ سے گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ سردار کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے اس پر نام نہاد ایک مذہبی پنڈت (ملا) اپنی مذہبی دکانداری چمکانے کی کوشش میں مختلف ہتھکنڈے آزماتا ہے مگر یہ ظالم جاگیردار اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ بہانہ تو گھوڑے سے گرنے کا ہوتا ہے مگر اپنی نجس روش کی بنا پر ایک خوف ناک بیماری کرونا کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔ وہ جاگیردار جو طاقت و دہشت کا عظیم پہاڑ بنا پھرتا تھا کسی غریب سے ہاتھ ملانا یا سلام کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا، اس کے جنازے میں خاندان کے چند افراد کے سوا کسی کو بھی شریک ہونے کی اجازت نہیں ملی کہ اس موذی مرض سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"نورے کی ننگی پیٹھ پر زناٹے دار ہنٹر برساتے ہوئے، وہ نورے کی بہن کو زار وقطار روتے سن کر، ایک لمحے کو رکا، وہ سامنے آلوؤں کے کھیت میں دوسرے عورتوں کے ساتھ، کھڑی دو ہتڑ، سینے پر مارے جا رہی تھی۔ سردار نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور دوبارہ نورے کی کمر اور گات پر ہنٹر برسانے لگا گیے۔ میراثی نے نورے پر ترس کھا کے سردار کو روکنا چاہا، لیکن سردار کے بگڑے تیور کو دیکھ کر دبک گیا۔ اس دوران نورا ماچھی، بے حس ہو کر، ڈگالے سے بندھا جھولنے لگا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔۔۔ ہاں اس فرعون کو کرونا کے علاوہ کون برباد کر سکتا تھا۔ وہ دکھائی نہیں دیتا ورنہ سردار کے لوگ، اسے چبا کے کھا جاتے۔ اب شہر کا قرنطینہ میں پڑا سڑ رہا ہے۔" 32

دراصل علی تنہا نے اس حقیقت سے پردہ فاش کیا کہ جنوبی پنجاب میں غریب عوام کی کوئی زندگی نہیں۔ اس خطے میں اس جاگیردارانہ نظام نے عوام سے خوشیاں اور ان سے جینے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ یہ طاقت ور طبقہ اپنے جرائم اور دولت کے اکٹھ میں غریب عوام اور مزارعین کو ان کی زندگی کے بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا ہوا ہے۔ کسی کے انکار یا اختلاف پے اس کو سب کے سامنے نشان عبرت بنانا گھر کے دیگر افراد پر ظلم و ستم کرنا ان جاگیرداروں کا مشغلہ ہے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے۔ اسی جاگیردارانہ سوچ اور نظام کی وجہ سے جنوبی کے عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

حوالہ جات

1 Mubashir khan,SouthPunjab is a victum of neglect, Dawn, Jan 5th 2023

۲۔ علی، مبارک۔جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر،لاہور: مشعل بکس،۱۹۹۶ء، ص ۱۵۲۔

۳۔ انجم، وکیل۔سیاست کے فرعون،لاہور: فیروز سنز، س ن، ص ا۔

۴۔ علی، مبارک۔جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر،لاہور: مشعل بکس،۱۹۹۶ء، ص ۱۵۴۔

5 Khan etal, Econnmic effects of climate change.Mnducedloss of agricultural production by 2016-2050. A case of study of Pakistan.Sustainability 2020.

۶۔ قاضی، راشدہ۔36 گھنٹوں میں سے 15 منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص ۶۰۔

۷۔ قاضی، راشدہ۔حرف اور ہندسہ،لاہور: زاہد شبیر پرنٹرز، ۲۰۲۰ء، ص ۳۸۔

۸۔ نوشین، دردانہ۔ریت میں ناؤ، اسلام آباد: یورپ اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۷۔

9 Mubashir khan, south punjab is a victim of neglect, Pakistan Today January 20,2023.

۱۰۔ خان، حفیظ۔لاہور جان اور دوسری کہانیاں،لاہو: فائن گراف پرنٹرز، ۲۰۲۰ء، ص ۱۱۰۔

۱۱۔ اختر، جاوید۔مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۷۴۔

۱۲۔ ہاشمی، جاوید۔ہاں میں باغی ہوں،لاہور: ساگر پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۴۔

13 Muhammad Huzaifa Elahi , south Punjab. neglected and politicized, the McGill international Review April 4,2019.

۱۴۔ تنہا، علی۔سورج کے سب لوگ، ملتان: پاک شہید پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۷ء، ص ۶۶۔

۱۵۔ انجم، وکیل۔سیاست کے فرعون،لاہور: فیروز سنز، س ن، ص ۱۰۔

۱۶۔ ایضاً ص ۱۹۔

۱۷۔ احمد، کلیم الدین۔(ایڈیٹر) جامع انگلش اردو ڈکشنری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸۶۔

۱۸۔ جالبی، جمیل۔قومی انگلش اردو ڈکشنری، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء، ص ۷۳۶۔

19 The new Encylopaedia Britannica , volume 4 Encyclopaedia Britannica, p 775.

۲۰۔ علی، لیاقت۔ عابد، عبدالرحمن۔ "پاکستانی اردو افسانے میں پنجابی دیہات کا ایک نمایاں کردار: جاگیر دار" مشمولہ معیار، اسلام آباد: آئی آر ڈی، جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۱۔

۲۱۔ ہاشمی، جاوید۔ ہاں میں باغی ہوں، لاہور: ساگر پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۳۔

۲۲۔ علی، مبارک۔ جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر، لاہور: مشعل بکس، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۹۔

۲۳۔ قاضی، راشدہ۔ 36 گھنٹوں میں سے 15 منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص ۹۹۔

۲۴۔ اختر، جاوید۔ سانپوں سے نہ کانٹے کا وچن، ملتان: قندیل پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۔

۲۵۔ ہاشمی، جاوید۔ ہاں میں باغی ہوں، لاہور: ساگر پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۸۷۔

۲۶۔ خان، حفیظ۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، لاہور: فائن گراف پرنٹرز، ۲۰۲۰ء، ص ۲۱۔

27 Shukat Qadir, south Punjab. Neglected and politicized , the McGill International Review.

۲۸۔ علی، لیاقت۔ پلیٹ فارم، ملتان: ضوریز پرنٹرز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۴۔

۲۹۔ احمد، انوار۔ ایک ہی کہانی، لاہور: سنگ میل، ۱۹۹۶ء، ص ۳۵۔

۳۰۔ علی، لیاقت۔ عابد، عبدالرحمن۔ "پاکستانی اردو افسانے میں پنجابی دیہات کا ایک نمایاں کردار: جاگیر دار" مشمولہ معیار، اسلام آباد: آئی آر ڈی، جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۶۔

۳۱۔ اعجاز، احمد۔ کہانی مجھے تلاش کرتی ہے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۷۷۔

۳۲۔ تنہا، علی۔ "کرونا کا تاج"، مرزا حامد، پاکستان میں اردو افسانہ (۱۹۴۷ تا حال)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۳ء، ص ۹۰۹۔

ماحصل

ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ قدرت نے انسان میں جو سرمدی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کا اظہار ادب ہے۔ ادب تخلیق کرنا بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے، کیونکہ ادیب اپنے گردوپیش سے confirm نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔

اردو زبان میں مزاحمت کا لفظ عربی زبان کے لفظ 'زحم' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی مخالف سے ٹکرانا یا مخالفت کے مقابلے میں مدافعت و محافظت ہے۔ مزاحمت کے لفظ کا تعلق عربی زبان سے ہے۔ عربی میں مزاحمت کے مترادف، مقاومہ اور معارضہ ہیں۔ مقاومہ کا ممبع قوم ہے، جس کا مطلب ہے ہمسری کرنا یا مخالفت کرنا۔ اردو میں مقاومہ کے لیے مقاومت کا لفظ مستعمل ہے۔ انگریزی زبان میں مزاحمت کے لیے Resistance کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے مراد وہ عمل ہے جو کسی نظریہ یا عمل سے اختلاف کرنا اور ناپسندیدہ رویے کے خلاف مؤثر اقدامات اٹھانے کے ہیں۔

اردو زبان میں مزاحمت کے لیے کئی متبادل الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن میں احتجاج، بغاوت، مدافعت، ممانعت، رکاوٹ اور تعرض وغیرہ۔ احتجاج کا لغوی معنی اعتراض یا انکار ہے، احتجاج کسی بھی صاحب اقتدار یا صاحب اختیار کے خلاف اس کی ناپسندیدہ پالیسیوں کے سبب کیا جاتا ہے۔ احتجاج کے بہت سے پہلو ہیں جن میں ایک پہلو احتجاجاً ناپسندیدہ عمل کے خلاف تقریر کرنا یا تحریر کے توسل سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا ہے۔ جب احتجاج کے ذریعے معاملات کا تصفیہ نا ہو تو بغاوت کا جنم ہوتا ہے۔ کسی نظام کے خلاف عملی ٹکراؤ یا مہم کو اصطلاحاً بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یونہی حکومت وقت یا کسی ریاستی طاقت کی حکم عدولی کرنا بھی بغاوت کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ جن ریاستوں میں حکومت عوام الناس کے حقوق غصب کر رہی ہو ان ریاستوں میں عوام کی طرف سے مختلف سطح پر بغاوت کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ انقلاب کسی سماجی ناہمواری کے مقابلے میں لوگوں کا باقاعدہ اجتماعی تحریک کے ذریعے مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔ انقلاب ملک کے اندرونی معاملات کو نئی ڈگر پر ڈالنے کا نام ہے۔ جب کسی ملک کے حکمران عوام کے بنیادی حقوق کا استحصال کریں تو وہاں کی عوام اس استحصال کے خاتمے کے لیے انقلاب کی راہ چل پڑتی ہے۔ انقلاب کے لیے ایک لفظ فرار کا بھی استعمال کیا جاتا ہے، یعنی ہر اس چیز یا طاقت سے راہ فرار اختیار کرنا جس سے انسان خوف کھاتا ہے۔ انسان کے دوران خون میں ہیجانی رد عمل خطرناک، تکلیف دہ اشیا اور واقعات سے گریز کا عنصر پیدا کرتا ہے۔ مزاحمت ایک فطری

عمل ہے۔ مزاحمت ایک ایسا رویہ/احساس ہے جو تخلیقِ حیات سے ہی ہر جاندار کی جبلت میں موجود ہے۔ مزاحمت ہر زندہ چیز میں کسی نہ کسی انداز سے موجود ہے۔ اپنی ساخت کے اعتبار سے مزاحمت دو پہلو رکھتی ہے۔

۱۔ انفرادی مزاحمت ۲۔ اجتماعی مزاحمت

انفرادی مزاحمت کا تعلق اکیلے فرد سے ہوتا ہے۔ جب سماج کا کوئی فرد کسی رویے سے استحصال اور محرومی کا سامنا کرتا ہے تو وہ اپنی ذات کے تحفظ کے لیے مزاحمتی اسلوب اپناتا ہے۔ کبھی اسے اپنے ماحول سے مختلف خطرات کا سامنا ہوتا ہے، بعض اوقات اسے اپنے ہی جیسے انسانوں سے اندیشے لاحق ہوتے ہیں تب وہ اکیلا فرد اپنی ذات کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے جو مزاحمتی رویہ اپناتا ہے اسے انفرادی مزاحمت کہتے ہیں۔ معاشرے کے افراد یا ایک طبقہ ظلم وجبر یا استحصال کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنی بقا کے لیے مزاحمت کا راستہ اپناتا ہے تو یہ اجتماعی مزاحمت کی کیفیت ہے۔ مزاحمت انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں پہلوؤں میں مقصد اپنے حقوق کا تحفظ ہے۔ مزاحمت جبری رویوں کے خلاف شعور کی بیداری کا نام ہے۔ مزاحمت کی یہ فطرت ہے کہ اسے جبر کسی صورت قبول نہیں، خواہ یہ جبر ریاستی اداروں کی طرف سے ہو یا کسی سماجی گروہ کا ہو۔ مزاحمت کی عملی اعتبار سے دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک کیفیت وہ ہے جو عمومی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، سماج میں کسی ظالم، غاصب کے خلاف اسلحہ تک اٹھا لینا ہے۔ مزاحمت کی دوسری عملی کیفیت انتہائی گنجلک اور خالصتاً داخلی حیثیت رکھتی ہے۔ مزاحمت کی اس صورت میں معاشرے کا حساس ترین طبقہ یعنی ادیب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ادبی تخلیقات کر رہے ہوں، اپنے زورِ قلم کا استعمال کرتا ہے۔ ظلم وجبر اور عوامی استحصال کے خلاف لفظی اور تحریری جنگ لڑتا ہے۔ مزاحمت کو جواز فراہم کرنے کے لیے کئی پہلو موجود ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت
۲۔ لسانی جبر کے خلاف مزاحمت
۳۔ سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت
۴۔ مذہبی توہم پرستی کے خلاف مزاحمت
۵۔ آزادیٔ اظہار رائے کے لیے مزاحمت
۶۔ زرعی استحصالی نظام کے خلاف مزاحمت
۷۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف مزاحمت

مزاحمت آفاقی معانی رکھتی ہے، اس کا دائرہ کار وسیع تر رقبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا تعلق صرف صنفِ انسانی تک مقید نہیں بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ مزاحمتی عمل میں مصروفِ کار ہے۔ جیسے برائی کے خلاف نیکی کی مزاحمت، روشنی کی اندھیرے کے خلاف مزاحمت وغیرہ۔

عالمی ادب کے منظر نامے پر دیگر زبانوں کی ادبیات کے مانند اردو ادب میں بھی مزاحمت ایک مضبوط روایت کے طور پر موجود ہے۔ اردو زبان و ادب کی ابتدا ایسے عہد میں ہوئی جب پورا ہندوستان سیاسی، سماجی اور تہذیبی انحطاط کی لپیٹ میں تھا۔ اردو ادب میں مزاحمت کی ابتدا مغلیہ سلطنت کے عہد زوال سے منسلک ہے۔ جعفر زٹلی اردو شاعری میں مزاحمت کی قدیم آواز کے حوالے سے ایک مستحکم آواز اور بڑا نام ہے۔ جس نے مختلف اصناف سخن میں مزاحمت کا رویہ اپنایا۔ مثلاً غزل، نظم اور ہجویات وغیرہ میں احتجاجی تخیل کے حامل اشعار تخلیق کیے۔ جعفر زٹلی کو مزاحمت کا تندو تلخ انداز اپنانے کی پاداش میں ہندوستان کے مغل فرمانروا فرخ سیر نے تختہ دار پر لٹکا دیا۔

جعفر زٹلی کے بعد میر تقی میر، مرزا غالب، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور حبیب جالب جیسے قدآور شعراء نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی شاعری میں مزاحمت کو سمویا۔ اردو کے مزاحمتی ادب کی تخلیق و روایت میں شعراء کے ساتھ ساتھ ادباء نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ خصوصاً بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سماج دشمن پر پہلی کرب ناک ضرب اور تیز و تند مزاحمتی تخلیق ''انگارے'' شہرائے آفاق ہے۔ جس کا منصۂ شہود پر آنا سامراج کے بڑے بڑے دیو ہیکل عناصر کے لیے بھیانک خواب ثابت ہوا۔ سماج دشمن عناصر نے اس افسانوی مجموعہ اور اس کے تخلیق کاروں کی مخالفت میں بڑی شد و مد کے ساتھ جدوجہد کی اور اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ ''انگارے'' جیسے افسانوی مجموعہ نے آنے والے دور کے لیے مزاحمتی ادب کے لیے نئے جہانوں کا کھوج دیا۔

اردو افسانوی ادب میں سماج دشمن عناصر کے خلاف مزاحمت کی بھرپور طاقت پائی جاتی ہے، جنوبی پنجاب میں یہاں کے منتخب افسانہ نگاروں نے خطے میں استحصالی اور استعماری عناصر کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ہے۔ جنوبی پنجاب جو کہ اپنی جغرافیائی حدود، تہذیبی اقدار اور بہترین میدانی زمینوں کا حامل خوب صورت خطہ ہے، اسے مختلف انواع کے بدصورت سماج دشمن عناصر نے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ جہاں غریب، غریب سے غریب اور جاگیر دار، سرمایہ دار طبقہ دن بدن طاقت ور، اور دولت مند ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں غریب مزارعین کی چادر و چار دیواری کو پامال کرنا، دانے دانے کو محتاج کرنا ان سرداروں، جاگیرداروں کا شوق ہے۔ اس خطے کے عوام ان سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں موجود دردِ دل اور سوز دروں رکھنے والے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اس خطے کی عوام کے حقوق کے لے بھرپور طاقت سے اپنی مزاحمتی آواز بلند کی ہے۔ مقتدر افسانہ نگاروں کے افسانوی میں مزاحمت اور ان کے فکری زاویے درج ذیل ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ جاوید اختر بھٹی جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں میں بلند مقام پر فائز ہیں۔ ان کے افسانوں میں ظلم، جبر اور استعماری رویوں کے خلاف بھرپور مزاحمت ہے۔ جاوید اختر بھٹی، طبقاتی تقسیم کے سخت مخالف ہیں خصوصاً جاگیر دار طبقے کے ہاتھوں غریب کسانوں کا استحصال اور مزارعین کی تذلیل کو اجاگر کیا۔ جاوید اختر

بھٹی ایک بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں کہیں علاقائی تو کہیں بیانیہ انداز میں کھل کر مارشل لاءڈکٹیٹر، افسر شاہی اور انسانی حقوق کے لیے سماج دشمن عناصر کے خلاف مزاحمت کی۔

۲۔ علی تنہا جنوبی پنجاب کی افسانوی روایت کو ایک نیا زاویہ دیتے ہیں، قدیم وجدید کا خوب صورت امتزاج ان کے افسانوں کی نمایاں خوبی ہے۔ علی تنہا نے اپنے افسانوں میں علامت نگاری کو دل کش انداز میں استعمال کیا ہے، یہ علامتیں زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی آئینہ دار ہیں۔ علی تنہا سماجی ومعاشی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور فہم وفراست کی بنا پر معاشرے کے نباض ہیں۔ ان کے افسانوں میں سیاسی وسماجی جبر، معاشی و زرعی استحصال، مذہب توہم پرستوں اور مارشل لاءڈکٹیٹروں کے خلاف زبردست مزاحمت پائی جاتی ہے۔

۳۔ انوار احمد جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں میں مزاحمتی ادب کی ایک معتبر آواز ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی جبر، سیاسی ومذہبی مداریوں اور مارشل لاءڈکٹیٹروں کے خلاف بے باکی سے مزاحمت پائی جتی ہے۔ انسانیت کی تذلیل پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ظلم وستم اور معاشی استحصال کے خلاف طاقتور مزاحمت موجود ہے۔

۴۔ حفیظ خان اردو افسانوی ادب میں طاقتور مزاحمتی پیرانیۂ اظہار رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں پولیس گردی، افسر شاہی، سماجی ومعاشی استحصال، انصاف کی عدم فراہمی اور بیوروکریسی کی چال بازیوں سے پردہ اٹھایا۔ ان کی کہانیوں کے مرکزی کردار معاشرے کے ایسے افراد ہیں جن پر کوئی دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ حفیظ خان نے اپنے افسانوں میں جنوبی پنجاب میں سرداروں، جاگیرداروں کے ظلم وستم اور بنیادی انسان حقوق کی پامالی کے خلاف کھل کر مزاحمت کی۔

۵۔ لیاقت علی محض جنوبی پنجاب کے اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے مزاحمت نہیں کرتے بلکہ ان کے افسانوں میں حقائق نگاری بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ لیاقت علی نے تعلیمی، سماجی ومعاشی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف مزاحمتی انداز اپنایا ہے۔ انہوں نے بطور افسانہ نگار اپنے افسانوں میں عام قاری تک کے ذہن میں مزاحمتی شعور پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

۶۔ راشدہ قاضی جنوبی پنجاب میں اردو کی اعلیٰ قدر افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں خطۂ جنوب میں ہونے والے ظلم وجبر اور ہر طرح کے ناپسندیدہ عناصر کے خلاف کھل کر مزاحمت کی۔ راشدہ قاضی نے اپنے افسانوں کے ذریعے منفی سیاست، زرعی استحصال، جاگیرداروں کے بہیمانہ / فحش کردار، مذہبی ٹھیکہ داروں بالخصوص دینی اور مذہبی تعلیمات سے نابلد گدی نشینوں کے غیر فطری رسوم ورواج، سماج میں خواتین کے

بارے میں نظریات اور استحصالی رویوں کو اپنی مزاحمت کا ہدف بنایا ہے۔ گویا وہ ہر ایک غیر فطری رویے کے سامنے مزاحمت پر آمادہ ہیں۔

۷۔ دردانہ نوشین خان جنوبی پنجاب کے اردو افسانہ نگاروں میں ایک کہنہ مشق اور بلند شعور کی حامل افسانہ نگار ہیں، جو اپنے معاشرے میں موجود افراد کی ہمہ قسمی محرومیوں پر آواز بلند کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں تعلیم، صحت، بنیادی انسانی حقوق کی عدم فراہمی اور جاگیر داری نظام کے خلاف کڑی تنقید کی ہے۔ گویا دردانہ نوشین خان معاشرے کے لیے سوز اور دردِ دل رکھنے والی اعلیٰ شعور کی حامل افسانہ نگار ہیں۔

۸۔ احمد اعجاز سماجی شعور اور بنیادی انسانی حقوق کے بارے آشنائی رکھنے والا ایک ابھرتا ہوا ادیب ہے جنوبی پنجاب کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں انہیں شمار کیا جاتا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی، جمہوری حقوق کی پامالی، سیاسی و معاشی جبر و استحصال کے خلاف ان کے افسانوں میں مزاحمت کی بھرپور قوت ملتی ہے۔ احمد اعجاز حساس، نوکیلے الفاظ سے معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر کے خلاف مزاحمت کرتے اور ان کے غلط رویوں کو تہہ و بالا کرتے نظر آتے ہیں۔

تحقیقی نتائج

۱۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں مزاحمتی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمہ قسمی استحصال کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ جس سے قاری کو ہمہ قسمی استحصالی اور استعماری نظام کے خلاف مزاحمتی شعور ملتا ہے۔

۲۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اپنے مزاحمتی اسلوب رکھنے والے افسانوں میں سماج دشمن عناصر کے اوچھے ہتھکنڈوں کو واضح انداز میں تحریر کیا اور ان ناپسندیدہ عناصر کو نمایاں کیا ہے۔

۳۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ان کی شخصیت کی حساسیت اور سوزِ دل واضح موجود ہے، اسی لیے وہ سماج پر ہونے والے کسی بھی استحصالی حملے پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ مجبور اور مظلوم عوام کے ساتھ ہونے والی بربریت برداشت نہیں کر پاتے اس لیے ان کا قلم ان عناصر کے خلاف مزاحمت کے لیے برسرپیکار ہو جاتا ہے۔

۴۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں مزاحمتی عناصر کی عکاسی علامتی، بیانیہ اور کہیں کھلم کھلا انداز میں کی ہے۔ تعلیم، صحت، عدل و انصاف کی عدم فراہمی، بنیادی حقوق، آزادی اظہار رائے، سیاستدانوں اور جاگیر داروں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

۵۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں خطہٗ جنوب میں وقوع پذیر ہونے والی سیاسی کشمکش، جغرافیائی محرومیوں، طبقاتی تقسیم، جاگیر دارانہ نظام اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو موضوع سخن بنا کر سماج کو شعور بخشا۔

۶۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں سماجی استحقاق، جابرانہ رویے، ذہنی اور نفسیاتی دباؤ، اقتصادی و معاشی جبر، تہذیبی و ثقافتی جبر، بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی، آزادی اظہار رائے، معاشی استحصالی نظام، تعلیم و صحت کی سہولیات کی عدم موجودگی، زرعی استحصال اور مارشل لاءڈکٹیٹروں کے رویے جنہوں نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظر کو شدید متاثر کیا، اس کا اردو افسانے میں بھرپور اظہار کیا۔

۷۔ جنوبی پنجاب کی اشرافیہ اور حکومتی گٹھ جوڑ سے جنوبی پنجاب کے باسی بحیثیت مفید شہری بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ جنوبی پنجاب کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں سیاست دانوں، جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے سامراجی نظام سے پیدا ہونے والی فکری، معاشی اور معاشرتی گھٹن کو اپنے افسانوں کے ذریعے اظہار کی راہیں دیں۔

سفارشات

۱۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے ہاں بہت سے سماج دشمن عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادبی متون میں ان عناصر کے خلاف مزید پوری قوت سے آواز بلند کی جائے۔

۲۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں کے حوالے سے قابل قدر کام موجود ہے، مگر اسے یہیں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ سماجی و معاشی مسائل اور بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے مزید کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں علامتی اسلوب پیرائیہ اظہار اور داخلی تکلم کے لحاظ سے اور بھی کام کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ جنوبی پنجاب کے منتخب اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں کہیں بیانیہ، علامتی اور تجریدی انداز کا استعمال کر کے دبے لفظوں میں مزاحمتی رنگ اپنایا گیا ہے، جسے مزید واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

احمد، غفور۔ پھر مارشل لاء آگیا، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۸ء

احمد، انوار۔ اردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۷ء۔

احمد، انوار۔ اردو افسانہ، تحقیق و تنقید، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۸ء۔

احمد، انوار۔ ایک ہی کہانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء۔

احمد، انوار۔ آخری خط، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

اختر، جاوید۔ چاند کے زخم، ملتان: پاکیزہ پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱ء۔

اختر، جاوید۔ ربی ذات، لاہور: دار الکتاب عزیز مارکیٹ، ۲۰۰۱ء۔

اختر، سلیم۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

اختر، جاوید۔ سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن، ملتان: قندیل پبلشرز، ۲۰۱۶ء۔

اختر، جاوید۔ مگر تم زندہ رہنا، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء۔

اختر، سلیم۔ افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: سنگ میل، پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔

اشرف، اے۔ بی۔ کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

اعجاز، احمد۔ کہانی مجھے تلاش کرتی ہے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء۔

اقبال، طاہرہ۔ پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔

امجد، رشید۔ مرتب، مزاحمتی ادب لاہور، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء۔

انجم، شفیق۔ اردو افسانہ (تحقیق و تنقید) اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء

انجم، وکیل۔ سیاست کے فرعون، لاہور: س ن

آفاقی، اقبال۔ اردو افسانہ (فن، ہنر اور متنی تجزیے)، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

بدر، جہانگیر۔ جمہوریت کا ارتقا، لاہور: اعزاز الدین ٹی۔ بی۔ ایم پبلشرز، ۲۰۰۷ء

بریلوی، عبادت۔ افسانہ اور افسانے کی تنقید، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۶ء۔

بیگ، حامد۔ پاکستان میں اردو افسانہ (۱۹۴۷ء تا حال)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۳ء

بیگ، حامد۔ اردو افسانے کی روایت، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء۔

پوری، فرمان فتح۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

ترین، روبینہ۔ تاریخ ادبیات ملتان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۳ء۔

تنہا، علی۔ الٹے رخ کا دریا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء۔

تنہا، علی۔ بھول کی گھنٹیاں، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

تنہا، علی۔ سورج کے سب لوگ، ملتان: سنجوک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

تنہا، علی۔ کئی دنوں کا دن، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۵ء۔

جعفر، مہدی۔ افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں، دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

جمیل، خاور۔ ادب، کلچر اور مسائل، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء

حسین، احتشام۔ تنقید اور عملی تنقید، لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء

حسین، اختر۔ ادب اور انقلاب، حیدرآباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ء

خان، حفیظ۔ لاہور جان اور دوسری کہانیاں، اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

خٹک، خوشحال۔ معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۸۹ء

ریحانہ، نگہت۔ اردو افسانے کی مختصر تاریخ، لاہور: بک وائسز، ۳ ٹمپل روڈ، ۱۹۸۷ء۔

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو ادب، ۲۰۱۵ء

علی، مبارک۔ جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر، لاہور: مشعل بکس، ۱۹۹۶ء

علی، لیاقت۔ پلیٹ فارم، ملتان: صوریز پبلشرز، ۲۰۰۸ء۔

علی، لیاقت۔ جھوٹے آدمی کے اعترافات، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۷ء۔

علی، مبارک۔ تاریخ اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء

غلام رسول۔ اسلام کا عمرانی نظام، لاہور: علم عرفان پبلشرز، ۲۰۰۴ء

فاروقی، ایم اے۔ افسانے کے مباحث، کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۷ء۔

قاضی، راشدہ۔ پہلی سی محبت، ملتان: شعبہ اردو، جامعہ زکریا ملتان، ۲۰۱۲ء۔

قاضی، راشدہ۔ حرف اور ہندسہ، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۲۰ء۔

قاضی، راشدہ۔ ۳۶ گھنٹوں میں سے ۱۵ منٹ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء۔

کرشن، گوپال۔ سماج شاستر، آگرہ: ایس بیپی ڈی پبلشنگ، ۲۰۰۹ء

کریم، ارتضٰی۔ اردو ادب: احتجاج اور مزاحمت کے رویے، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۴ء

نارنگ، گوپی چند۔ آزادی کے بعد اردو افسانہ، لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۰ء۔

نوشین، دردانہ۔ ریت میں ناؤ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء۔

نوشین، دردانہ۔ پہلا زینہ، لاہور: زاویہ پبلشرز، ۲۰۰۴ء۔

نوشین، دردانہ۔ ریگ ماہی، لاہور: الحمد پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔

[faint library stamp]